غزل بتائے گی
علی یاسر

غزل بتائے گی

علی یاسر

نستعلیق مطبوعات

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ○

القرآن

اہتمام: حسن عباسی

سرورق: احمد حبیب

تزئین: سجاد احمد

اشاعت: جنوری ۲۰۱۶ء

طباعت: نسٹ پریس، اسلام آباد

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت: ۳۰۰ روپے

بیرون ملک: ۱۵ امریکی ڈالر

رابطہ شاعر

علی یاسر، اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد

فون: 0333-5151136

ای میل: aliyasir76@gmail.com

فیس بک: ali.yasir.35

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ،

اردو بازار، لاہور

0300-4489310

E-mail: nastalique@yahoo.com

انتساب

اجزائے ذات

عمار، محسن، عزہ، زین، انا

کے نام

تشکرِ قلبی

ارشاد راؤ

خرم لطیفی

حیدر علی شاہ

طارق علی بسرا

مظہر اقبال گجر

فہرست

عقیدہ

وہ جو ذکرِ خدا نہیں کرتا
اُس کا دل بھی بسا نہیں کرتا

بندگی میں ہیں محو شام و سحر
کون حمد و ثنا نہیں کرتا

وہ سخن ور بھی کیا سخن ور، جو
مدحتِ مصطفیٰؐ نہیں کرتا

کیا یہ عشقِ علیؑ نماز نہیں؟
جو کبھی میں قضا نہیں کرتا

آ درِ پنجتن پہ جھک جا تُو
فرض کیوں کر ادا نہیں کرتا

غمِ شبیرؑ دل میں ہے آباد
غم کسی اور کا نہیں کرتا

منتظر ہوں امام آخر کا
اپنی ہستی فنا نہیں کرتا

میں اسے مانتا نہیں یاسرؔ
جو نبی سے وفا نہیں کرتا

کچھ اس طرح وہ دعا و سلام کرکے گیا
مری طرف ہی رخِ انتقام کرکے گیا

جہاں میں آیا تھا انساں محبتیں کرنے
جو کام کرنا نہیں تھا وہ کام کرکے گیا

اسیر ہوتے گئے با دلِ نخواستہ لوگ
غلام کرنا تھا اُس نے، غلام کرکے گیا

جو درد سوئے ہوئے تھے وہ ہوگئے بیدار
یہ معجزہ بھی مرا خوش خرام کرکے گیا

ہے زندگی بھی وہی جو ہو دوسروں کے لیے
وہ محترم ہوا جو احترام کر کے گیا

یہ سرزمیں ہے جلال و جمال و عظمت کی
ہے خوش نصیب یہاں جو قیام کر کے گیا

اُسی کے خواب کہ تھے باعثِ جوازِ نظر
جو سارے شہر کی نیندیں حرام کر کے گیا

ہے کون شاعرِ خوش فکر، کون ہے فنکار؟
غزل بتائے گی جو اِس میں نام کر کے گیا

اثر ہوا نہ ہوا بزم پر علی یاسرؔ
کلام کرنا تھا میں نے، کلام کر کے گیا

دُور کرنے کو تری زلف کا خم اتریں گے
آسمانوں کے ستارے کوئی دم اتریں گے

حوصلہ، اور ذرا حوصلہ اے سنگ بدست!
وقت آئے گا تو خود شاخ سے ہم اتریں گے

ایک امید پہ تعمیر کیا ہے گھر کو
اس کے آنگن میں کبھی تیرے قدم اتریں گے

ہمیں لکھنا ہے زمیں والوں کے غم کا نوحہ
آسمانوں سے کسی روز قلم اتریں گے

اتنی آہیں نہ بھرو، اشک نہ سارے بہہ جائیں
طبعِ نازک پہ ابھی اور بھی غم اتریں گے

جیسے ہم آنکھ ملا کر ترے دل میں آئے
لوگ اس زینۂ دشوار سے کم اتریں گے

شاد و شاداب اسی وقت رہوں گا یاسؔر
سرِ قرطاس جب اشعار کے یم اتریں گے

ہر طور فقیر مطمئن ہے
صد شکر ضمیر مطمئن ہے

اے زلف تُو بے قرار مت ہو
تیرا یہ اسیر مطمئن ہے

بارش، سیلاب، زلزلوں میں
شوقِ تعمیر مطمئن ہے

سر کٹ کے بھی سرکشی پہ مائل
لیکن شمشیر مطمئن ہے

میں دیکھ رہا ہوں، جل رہا ہوں
اس کی تصویر مطمئن ہے

درپیش ہے شوقِ نارسائی
میں چپ، تقدیر مطمئن ہے

اسلوبِ حیات بے ثباتی
طرزِ تحریر مطمئن ہے

کیوں راس نہیں فضائے زنداں؟
کیونکر زنجیر مطمئن ہے

پیوست ہے قلبِ آرزو میں
یاسرؔ یوں تیر مطمئن ہے

عہدِ صد مصلحت اندیش نبھانا پڑے گا
مسکرانے کے لیے غم کو بھلانا پڑے گا

جانتے ہیں کہ اجڑ جائیں گے ہم اندر سے
مانتے ہیں کہ تمھیں شہر سے جانا پڑے گا

آمدِ فصلِ بہاراں پہ کوئی جشن تو ہو
دوستو دل پہ کوئی زخم کھلانا پڑے گا

چشمِ بد دُور یہی اک مرا سرمایہ ہے
تیری یادوں کو زمانے سے چھپانا پڑے گا

تمھیں جانا ہے، چلے جاؤ مگر شرط یہ ہے
کہ بلاناغہ تمھیں خواب میں آنا پڑے گا

خود کو پہچان نہیں پائیں گے چہروں والے
انہیں آئینہ اوقات دکھانا پڑے گا

نظر انداز بھی کر سکتے ہو اخلاص مرا
یہ کوئی قرض نہیں ہے جو چُکانا پڑے گا

شاعری ہو تو نہیں سکتی کبھی تیرا بدل
کیا کریں دل تو کہیں اور لگانا پڑے گا

تھک نہ جائے وہ کہیں ہم پہ ستم کرتے ہوئے
یاسرؔ اس کا بھی ہمیں ہاتھ بٹانا پڑے گا

ہنروری تھی یہی بے ہنر کیے رکھا
ضرورتوں نے مجھے دربدر کیے رکھا

نہ منزلوں پہ نظر تھی، نہ راستوں کی خبر
سفر کا حکم ہوا تھا، سفر کیے رکھا

دراز متنِ تمنا اسی لیے نہ ہوا
کہ میں نے زحتِ جنوں مختصر کیے رکھا

سو دسترس میں خلا سے پرے کی دنیا تھی
نصیب نے مجھے بے بال و پر کیے رکھا

ہر ایک روز یہاں خواہشوں کا خون ہوا
لہو کے رنگ سے آنکھوں کو تر کیے رکھا

کہاں جمال مرا اور کہاں کمال مرا
کسی کے عکس نے مجھ پر اثر کیے رکھا

اُسی سے پوچھیے گا بد گمانیوں کا علاج
اِدھر کی بات کو جس نے اُدھر کیے رکھا

ہوا کے سامنے جیسے چراغ ہوتا ہے
بہ پیشِ تیغِ جفا میں نے سر کیے رکھا

نہیں ہے خوفِ شکست اور پہل نہیں کرتا
یوں دشمنوں کے دلوں میں بھی گھر کیے رکھا

کتنا ہے عذاب شعر کہہ کر
ملتا ہے ثواب شعر کہہ کر

دیکھوں کیا گل کھلا رہے ہو
لاؤ تو جواب شعر کہہ کر

کیا شعر کے جوہری یہیں ہیں؟
لایا ہوں جناب شعر کہہ کر

نیند آئے گی اس وظیفے کے بعد
دیکھوں گا خواب شعر کہہ کر

کوئی مرا معترف نہیں ہے
میں ہوں بے تاب شعر کہہ کر

کچھ لوگ خراب ہو رہے ہیں
بے چارے خراب شعر کہہ کر

گلدستۂ فکرِ نو یہی ہے
کھلتے ہیں گلاب شعر کہہ کر

تو خوش ہے کہ آیا وقتِ تنقید
میں ہوں شاداب شعر کہہ کر

میرا ہی بھرم بڑھا رہے ہیں
میرے احباب شعر کہہ کر

یاؔسر تُو دِل گرفتہ کیوں ہے؟
لا اور کتاب شعر کہہ کر

خوش ہوا ہے دیکھ کر یہ ایک باسی شہر کا
ڈوبتے سورج کا منظر اور کنارہ نہر کا

اس قرینے کو کوئی بھی نام دے سکتے نہیں
اس کا ہے مجھ سے جو ہے دریا سے رشتہ لہر کا

اس کی یادوں پر ہمیشہ سے رہا دار و مدار
قافیے کا، شعر کا، تخئیل کا اور بحر کا

ہے مرے ہاتھوں میں بھی پیمانۂ صدقِ حیات
ہے یہی مسنون میں پی لوں پیالہ زہر کا

ہر بڑی ہستی کی ناقدری یہاں ہوتی رہی
یہ رویہ تو مروّج ہے ازل سے دہر کا

یوں دیکھنے میں لگتا ہوں با اعتماد میں
اندر سے ختم اور ہوں باہر سے شاد میں

سمجھا گیا ہے آتش و آہن مرا وجود
رکھتا ہوں کتنے اور بھی ایسے تضاد میں

اپنے ہی موسموں کا خزاں خوردہ باغِ زیست
اپنے ہی دوستوں کا شکارِ جہاد میں

جب چاہے تجھ کو دیکھ لوں جب چاہے چھو سکوں
ایسا بھی کب ہوں صاحبِ بست و کشاد میں

مشکل ہو جو بھی دور وہ مشکل کشا کریں
حق ہے شہِ نجف پہ رکھوں اعتقاد میں

ہر دم رواں ہے سوئے مدینہ مرا خیال
اس در کو سوچتا ہوں پئے استناد میں

دل اس کو دے دیا نہیں جس کی خبر مجھے
کس دل سے کر رہا ہوں اسے آج یاد میں

وہ بد دعا میں ذکر مرا کر رہا ہے، خیر
دشمن کو بھی دعاؤں میں رکھتا ہوں یاد میں

اے شافعِ جزا ہے مجھے تیرا آسرا
آیا ہوں اپنے سر پہ گناہوں کو لاد میں

جیسے بھی گزارے خیر گزرے
جو لمحے ترے بغیر گزرے

اے بحرِ زمانہ میں تو ڈوبا
ہیں کون جو تیر تیر گزرے

آتے جاتے ہوئے مسافر
لے کر کوئی ہم سے بَیر گزرے

کتنوں نے مجھے کچل دیا تھا
کتنے مرے سر سے پَیر گزرے

دَم لینے کو ہے بقا سرائے
کرلی ہے جہاں کی سیر، گزرے

سہانے خواب وہ ہم کو دکھا کے چلتے بنے
جلا ہوا تھا چراغ اور بجھا کے چلتے بنے

یہیں کہیں مرے دل میں نشیمن ان کا تھا
عجب نہیں کہ وہ دل ہی چرا کے چلتے بنے

دکان کھولی ہے فنکار یار لوگوں نے
جو خود کو آتا نہیں وہ سکھا کے چلتے بنے

گماں کے سائے ہیں گرداں ہماری گلیوں میں
سکوں سے سوئے ہوؤں کو جگا کے چلتے بنے

ہمیں نہ جانے وہ کس کے حوالے کر کے گئے
ہمارے شہر سے بندے خدا کے چلتے بنے

مرے غموں کا یہاں پر کوئی علاج نہیں
اسی لیے مجھے دنیا کی احتیاج نہیں

تجھے یہ سن کے یقیناً خوشی ہوئی ہوگی
میں بے وفا ہوں مگر مستقل مزاج نہیں

ملا ہے جتنا ضرورت ہی میری اتنی تھی
نہیں ہے جس کی ضرورت وہ پاس اناج نہیں

ہے میرے بارے میں رائے جہان کی اچھی
کرو گے تم بھی یقیں کل سہی جو آج نہیں

تُو مہربان ہے جن پر طویل ہے فہرست
ہمارے نام کا ہی اس میں اندراج نہیں

لوگوں کو ڈس رہے ہیں ہماری زمین پر
شیطان بس رہے ہیں ہماری زمین پر

کتنوں کو اس نے گود میں اپنی سُلا لیا
کتنے نفس رہے ہیں ہماری زمین پر

ہم اشک وخوں سے آگ بجھانے میں ہیں مگن
شعلے برس رہے ہیں ہماری زمین پر

سر سبز کھیتیاں بھی سبھی نیلگوں ہوئے
مارِ ہوس رہے ہیں ہماری زمین پر

خورشید و ماہتاب و نجوم اور اک ہجوم
کتنے برس رہے ہیں ہماری زمین پر

کتنے قلندروں نے تونگر کیا اسے
مٹی سے مَس رہے ہیں ہماری زمین پر

یاسؔر ہمارا رزق اٹھا لے گئے ہیں غیر
اور ہم ترس رہے ہیں ہماری زمین پر

ہر ستارے میں بات ہوتی ہے
میرے بارے میں بات ہوتی ہے

دیکھیے گفتگو کا حسن ہے یہ
استعارے میں بات ہوتی ہے

ہم سمجھتے ہیں بے خبر سب کو
شہر سارے میں بات ہوتی ہے

کیسے آنکھیں کلام کرتی ہیں
جب اشارے میں بات ہوتی ہے

جب کوئی پاس ہو علی یاسرؔ
پل گزارے میں بات ہوتی ہے

✿

ہم نے اپنے لیے جو راہ نکالی اچھی
زندگی ایسی نہ تھی پھر بھی بنا لی اچھی

دل تو اپنا تھا سونبھنی ہی تھی اس سے لیکن
درد کے ساتھ بھی تا عمر نبھا لی اچھی

دمِ تحریرِ غزل خونِ جگر تھا برہم
سن کے احباب نے پھر بھی کہا ''خالی'' اچھی

ہم کو دشمن کا بھی منصب نہیں بخشا تُو نے
اور غیروں سے رہ و رسم بڑھا لی اچھی

جان کب چھوڑتی ہے جان کی دشمن دنیا
یہ بلا سر سے مرے عشق نے ٹالی اچھی

شہر چھوڑا تو کہیں کا نہیں چھوڑا اس کو
دشت میں سلطنتِ قیس سنبھالی اچھی

سامنے داد ہو اور بعد میں غیبت بن جائے
ایسی تعریف سے بدخواہ کی گالی اچھی

کون سا دور ہے اور جیتے ہیں کن لوگوں میں؟
جس نے جتنی بھی یہاں آن بچالی، اچھی

اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھ لیا ہے جب سے
ہم کو لگتی ہے بہت شام کی لالی اچھی

پاس آیا تو بہت خاص نہ محسوس ہوا
یاسرؔ اس کی تھی وہ تصویرِ خیالی اچھی

یہ اور بات کہ تجھ بن، تری تمنا میں
گزر رہے ہیں مرے دن تری تمنا میں

ترے شباب کے سیلاب میں نہ بہہ جائیں
جو خواب ہیں ابھی کم سن تری تمنا میں

نہ جانے کیا تجھے بھا جائے اور تُو آ جائے
سجا ہے ظاہر و باطن تری تمنا میں

اسی لیے تو کسی سے زیاں کا ذکر نہیں
کوئی نہیں مرا ضامن تری تمنا میں

ہر اک طرف سے جو کافر قرار پائے تھے
وہ لوگ ہو گئے مومن تری تمنا میں

زندگی کی کتاب دیکھتا ہوں
کیا ہوا انتساب، دیکھتا ہوں

تم بھی ہوتے ہو میرے پاس مگر
میں تمھارے ہی خواب دیکھتا ہوں

ایک چہرہ ہے میری آنکھوں میں
کیا گناہ و ثواب؟ دیکھتا ہوں

اس کی تعبیر ہے مرا ہونا
موت کو محوِ خواب دیکھتا ہوں

چشم و لب گنگ ہیں علی یاسرؔ
سامنے اس کا باب دیکھتا ہوں

جو کوئی عشق میں گھبرائے گا، مر جائے گا
اس کہانی کو جو دہرائے گا، مر جائے گا

موت منزل ہے تڑپتے ہوئے لوگوں کے لیے
کون کہتا ہے جو تڑپائے گا، مر جائے گا

تُو نے خوابوں سے نکالا ہے جو میرا پیکر
دل بھی سینے سے نکل جائے گا، مر جائے گا

میرے ہاتھوں میں قلم ہے، جو ہے تلوار سے تیز
جو مری فکر سے ٹکرائے گا، مر جائے گا

گر تمھیں اس کی انا کا نہیں اندازہ تو
یہ سمجھ لو وہ نہیں آئے گا، مر جائے گا

روز دیتا ہے صدا مجھ کو ضمیرِ زندہ
دیکھ توُ ہاتھ جو پھیلائے گا، مر جائے گا

اس نے جینے کی دعا دی ہے علی یاسرؔ کو
آخری سانس تک اترائے گا، مر جائے گا

ہے روشنی مرا عزم و یقیں چلا آیا
ستارہ ہوں میں برائے زمیں چلا آیا

میں سب سے قیمتی خلقت خدائے قدرت کی
مرا جواز ہے یونہی نہیں چلا آیا

ہے میری آہ مرے قہقہوں کی آہٹ میں
عزائے زیست میں خندہ جبیں چلا آیا

بساطِ دامنِ صد چاک تیری قسمت ہے
ترے وصال کو ایسا نگیں چلا آیا

عجب غضب ہے کہ دل ڈھونڈنے لگا خود کو
اِدھر جو آج وہی دل نشیں چلا آیا

زمیں سے داد رسی کی امید ٹوٹ چکی
سو نالہ جانبِ عرشِ بریں چلا آیا

خیال تھا کہ مرے دوستوں کی محفل ہے
سو دوستو! یہ ہوا میں یہیں چلا آیا

ہر ایک وقت ہے اس کا ہر ایک سُر کومل
غزل میں بن کے وہ اک بھیرویں چلا آیا

یہ کہہ کے گور بھی مجھ پر کشادہ ہونے لگی
خوش آمدید کہ میرا مکیں چلا آیا

اب احتیاط سے مطلب نہیں علی یاسر
کہ سامنے وہ مرا نکتہ چیں چلا آیا

ماضی ہوا کہ حال مری عمر سے گیا
کل ایک اور سال مری عمر سے گیا

اُس دن میں زندگی سے کنارہ کشی کروں
جس دن ترا خیال مری عمر سے گیا

جیسے بدن سے روح نکل کر چلی گئی
خود کو وہ یوں نکال مری عمر سے گیا

اُس کے لیے تو وقت کا دامن بھی تنگ ہے
جو لمحۂ وبال مری عمر سے گیا

کم سن سمجھ کے اُس نے رکھا امتحاں سے دُور
صحرا بھی مجھ کو ٹال، مری عمر سے گیا

آتا ہے بات بات پہ غصہ نہ جانے کیوں؟
لگتا ہے اعتدال مری عمر سے گیا

سانسوں کو روکنا کوئی آسان تو نہیں
اک عہدِ بے مثال مری عمر سے گیا

اُس کا گماں یہی تھا کہ وہ اپنے پاس ہے
لیکن وہ خال خال مری عمر سے گیا

اب آپ کو سکون کی نیند آئے گی سدا
لیں آپ کا ملال مری عمر سے گیا

وہ یاد آ رہا تھا کہ آنسو نہ رُک سکے
ضبطِ حدِ کمال مری عمر سے گیا

ساز میرا ہے ترنم تیرا
درد میرا ہے تبسم تیرا

لے تجھے آج قرار آئے گا
یہ مرا دل ہے جو گم صم تیرا

میرا سرمایہ وہ چشمِ مخمور
بادہ تیرا ہے، سبو، خم تیرا

ایک تاثیر تسلی تیری
ایک اعجاز تکلم تیرا

پوچھتا ہوں میں سوالِ دل ہے
کب کہو گے یہ مجھے تم، تیرا

ثبوتِ پارسائی دے رہا ہے
دل ایسے کب دہائی دے رہا ہے

تری آنکھیں جہاں تک بولتی ہیں
مجھے رستہ سجھائی دے رہا ہے

یہاں سے تو نظر آتا نہیں کچھ
وہاں سے کچھ دکھائی دے رہا ہے؟

ترے الفاظ میں ہے استغاثہ
ترا لہجہ صفائی دے رہا ہے

نہیں صحرا تلک یہ شور پہنچا
سمندر کو سنائی دے رہا ہے

چہرہ مرا احساس کی تصویر سے مس تھا
میں خواب کے دوران بھی تعبیر سے مس تھا

گھر آ کے بھی مجھ [illegible] وہی پرتو ہی
جس طرح سراپا اسی زنجیر سے مس تھا

کیوں کر نہ وہ خط چوم کے پڑھتا، دمِ تحریر
خامے کا دہن صفحۂ تحریر سے مس تھا

جب خلق نہ ہو پائے تھے جسموں کے قرینے
تب میرا مقدر تری تقدیر سے مس تھا

وہ میرا ہدف ہے، بھلا میں کس کا ہدف ہوں؟
اک خوف کا سایہ بھی مرے تیر سے مس تھا

سانسوں میں سلگ [illegible] ہے معصوم صحیفے
ہر حرفِ دعا شعلۂ تاثیر سے مس تھا

دشمن کی صفیں کاٹ کے یوں ہی نہیں رکھ دیں
اک بوسہ مرے قبضۂ شمشیر سے مس تھا

شعروں [illegible] ر آ [illegible] ضروری تھا کہ میرا
سینہ سخنِ میر تقی میر سے مس تھا

یہ ہم جو فلک تلے ہوئے ہیں
ہونا تو نہ تھا ولے ہوئے ہیں

کن سے ترے عشق میں گرفتار
کچھ لوگ برے بھلے ہوئے ہیں

ہم ہارنے والے تو نہیں تھے
کچھ اور معاملے ہوئے ہیں

دیکھو ہمیں بے ضمیر لوگو
ہم بھوک میں ہی پلے ہوئے ہیں

تاروں کی طرح ہوئے ہیں روشن
سورج کی طرح ڈھلے ہوئے ہیں

اسے مجھ کو بھلانے کا جنوں ہے
مجھے آنسو بہانے کا جنوں ہے

ابھی بے کار ہے اس کی تمنا
ابھی اس کو زمانے کا جنوں ہے

حقیقت پر یقیں یوں ہی نہیں ہے
حقیقت میں فسانے کا جنوں ہے

اسے وعدہ نہیں ہے یاد اپنا
ہمیں مر کر دکھانے کا جنوں ہے

یہ فردِ جرم دوبارہ نہ لگ جائے
مجھے گندم کے دانے کا جنوں ہے

ترا سر ہو میسر تو میں صدقے
یہی تو میرے شانے کا جنوں ہے

اسے تو ایک سیدھی بات کو بھی
گھمانے اور پھرانے کا جنوں ہے

نظر انداز ہو سکتا نہیں یہ
علی یاسر دِوانے کا جنوں ہے

ترے نگر میں بسر ایک رات کرنا تھی
پھر اپنے دشت کی راہِ نجات کرنا تھی

جو سوچ رکھا تھا ہم نے معاملہ نہ ہوا
وہ بات اور تھی ہم نے جو بات کرنا تھی

ثبوتِ عشق، ثباتِ دوام اور یہ مقام
ہمیں تو اپنے لیے نفیِ ذات کرنا تھی

ہمارے سامنے وہ ہاتھ جلوہ گر نہ ہوا
وگرنہ بیعتِ جاں اُس کے ہاتھ کرنا تھی

گزارہ ہو نہ سکا عارضی ٹھکانے میں
ہوئی نہ ہم سے کہ جیسے حیات کرنا تھی

کب ایک دوسرے کو دیکھنے کی ہمت تھی؟
دلوں کی بات نگاہوں کے ساتھ کرنا تھی

ہم اور طرح سے کرتے رہے دفاع اپنا
عدو نے اور کوئی واردات کرنا تھی

ملال و رنج کا احساس کیوں علی یاسر
اس آرزو میں ذرا احتیاط کرنا تھی

وہ نقشِ قدم محور و مقصود ہیں، میرے
مولا، ہوئے کعبے میں جو مولود، ہیں میرے

میرے لیے مانوس ہے وہ موت کی وادی
کچھ لوگ وہاں پہلے ہی موجود ہیں میرے

اُس روحِ تمنا کی مہک تک ہوئی رخصت
باقی جو بچے سانس وہ بے سود ہیں میرے

چہرہ ہے یہ کس کا مرے چہرے کی جگہ پر
آئینوں کے آئینے ہی مسدود ہیں میرے

آنکھیں جو کھلیں، دیکھا سکوتِ اجلِ خواب
تھا شور ستارے بڑے مسعود ہیں میرے

گرچہ ہوں گنہگار مگر ان کا گدا ہوں
خوش ہوں کہ نبی احمد و محمود ہیں میرے

معصوم ہیں اور کوئی خطا ان کی نہیں ہے
مظلوم جنہیں کھا گیا بارود، ہیں میرے

توحید مزاجوں میں مرا نام ہے ہر گام
سمجھاؤ جنہیں وہم ہے معبود ہیں میرے

میں قابلِ رشک ان کو سمجھتا نہیں یاسر
جن لوگوں کو دعویٰ ہے کہ محسود ہیں میرے

ذرّے کو آفتاب کِیا جانا چاہیے
تعبیر تجھ کو خواب کِیا جانا چاہیے

دریا کی لہر لہر اگر شعلہ بار ہے
صحرا میں قصدِ آب کِیا جانا چاہیے

اے شہرِ آسمان صفت اذن دے ہمیں
تجھ میں طلوعِ باب کِیا جانا چاہیے

ہر امتحانِ عشقِ بلاخیز ہو چکا
اب ہم کو باریاب کِیا جانا چاہیے

کچھ سوچ اپنے بارے میں پھر یہ بتا ہمیں
کیا تیرا انتخاب کِیا جانا چاہیے؟

ماحول سے مزاج موافق نہیں رہا
ترتیب کو خراب کِیا جانا چاہیے

شاید اسی وسیلے سے وہ دل میں جھانک لے
آنکھوں کو اب گلاب کِیا جانا چاہیے

اے درد تُو نے مجھ کو سنبھالا تمام عمر
تیرا بھی اب حساب کِیا جانا چاہیے

حق نے کہا علیؑ کے ہیں احساں زمین پر
اس کو ابو تراب کِیا جانا چاہیے

یاسرؔ شمارِ ضبطِ تمنا کے باب میں
تخمینۂ شباب کِیا جانا چاہیے

ہر گام پہ حیرت کا نیا باب کھُلا ہے
تعبیر پریشان ہے کیا خواب کھُلا ہے

اوجھل ہوئے آنکھوں سے تو پوچھا نہ کسی نے
اندازِ رخ پرسشِ احباب کھُلا ہے

ہم لوگ محبت کے روادار نہ ہوتے
تاخیر سے ہم پر دلِ بے تاب کھُلا ہے

ہونٹوں پہ لگا قفلِ خموشی نہیں ٹوٹا
سنتے ہیں یہ موسمِ ایجاب کھُلا ہے

بستی سے گزرتا ہے تو بستی نہیں رہتی
کن آنکھوں سے یہ چشمۂ سیلاب کھلا ہے

پہچان کے سینے سے لگایا اسے ہم نے
قاتل کی طرح چہرۂ گرداب کھلا ہے

لگتا ہے چھلک جائے گا اب جامِ تمنا
اس بار جو پیمانۂ اعصاب کھلا ہے

جیسا بھی ہے وقت اب نہ رکیں گے علی یاسرؔ
چلتے ہیں کہ دروازۂ مہتاب کھلا ہے

روشن ہوں سراپائے ستارہ بھی نہیں میں
اپنا بھی نہیں اور تمھارا بھی نہیں میں

نشہ مرے اعصاب پہ طاری ہے انا کا
یہ حال ہوا اپنا سہارا بھی نہیں میں

میری تو غرض تیری پسندیدگی تک ہے
کیا غم جو زمانے کو گوارہ بھی نہیں میں

یہ لوگ ہیں چالاک، سمجھنے لگے کیا کیا
کرتا تو کسی سمت اشارہ بھی نہیں میں

ہر گام پہ بہروپ بدلتی ہوئی دنیا!
آجاؤں گا دھوکے میں دوبارہ بھی؟ نہیں میں

تم جشن مناؤ کہ چراغ اور جلاؤ
جیتے ہو کچھ اس طرح کہ ہارا بھی نہیں میں

تقدیر نے اس بار توقع سے بھی ٹھانی
اٹھے نہ قدم اس کے، پکارا بھی نہیں میں

چلتا ہوں رُخِ بادِ عمومی کے مخالف
گویا روشِ عام کا دھارا بھی نہیں میں

انمول ہیں یہ خواب جو رکھے ہیں سجا کر
کچھ ایسا طلب گارِ خسارہ بھی نہیں میں

یاسرؔ وہ نہیں ہوں کہ بجھا دے جسے بارش
ہو جائے جو پانی وہ شرارہ بھی نہیں میں

تلخ حالات کے انگارے نگل جاتے ہیں
ہم تو مزدور ہیں جلتے ہوئے پل جاتے ہیں

رات کوئی بھی تھکے ہاروں کی بے خواب نہیں
جتنے ارمان ہیں خوابوں میں نکل جاتے ہیں

ہم نے آنکھوں میں رکھا پاک وطن کا نقشہ
کتنے طوفاں اسی تعویز سے ٹل جاتے ہیں

جتنی تکلیف بھی دے سکتی ہے دے لے دنیا
ہم ہیں مزدور جو گرتے ہیں سنبھل جاتے ہیں

زہر کھانے کو بھی پوری نہیں پڑتی اجرت
ہاتھ رکھتے ہیں تو پتھر بھی پگھل جاتے ہیں

جلتے سورج کی تمازت میں توانائی ہے
شام ڈھلتی ہے تو ہم لوگ بھی ڈھل جاتے ہیں

اپنی قسمت پہ رہیں خوش، بڑے خوش قسمت ہیں
ہم تو مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں

ہم کو بھی جینے کا حق سب کے برابر دے دے
ورنہ کہہ دے! تری دنیا سے نکل جاتے ہیں

بھوک سے جنگ رہی اپنی ہمیشہ یاسر
جانے کن لوگوں کے حالات بدل جاتے ہیں

قائم ہے ابھی زباں ہماری
سنتا جا داستاں ہماری

دیوار پہ نام ہے تمھارا
تصویر ہوئی کہاں ہماری

ہر خواب دعائے بے اثر ہے
گویا نہ ہوئی فغاں ہماری

وہ پوچھ رہے ہیں دشمنوں کو
ساری ہیں نشانیاں ہماری

یاسرؔ جو علی علی پکارا
مشکل نہ رہی یہاں ہماری

اندوختۂ سُود و زیاں ایک طرف ہے
ہم ایک طرف اور جہاں ایک طرف ہے

یہ منزلِ دنیائے تردد کا علاقہ
وہ قافلۂ دل گزراں ایک طرف ہے

اُس برق صفت شوخ کی آنکھوں میں نہ آیا
کیا شہر سے یہ اپنا مکاں ایک طرف ہے؟

آیا نہ مقابل صفِ اعدا سے کوئی بھی
گویا کہ جو تھا اُن میں جواں ایک طرف ہے

گلزار سے گزری تھی صبا گُل بہ کف و پا
آگ ایک طرف اور دھواں ایک طرف ہے

جی چاہتا ہے بانٹ دوں اپنا بھی سبھی رزق
درویش اُدھر، شورِ سگاں ایک طرف ہے

ہم راہ نوردِ تہی دامان ادھر ہیں
رختِ سفرِ ہم سفراں ایک طرف ہے

[illegible] میں کیا سب کو گرفتارِ تحیر
[illegible]ولِ ہنروانِ گماں ایک طرف ہے

آنکھ سے خواب لے گیا اور وہ اشک بھر گیا
عشق تھا یا خمار تھا وقت کے ساتھ اُتر گیا

خوشبو کو تازگی ملی، رنگوں کو روشنی ملی
آئی بہار تو ہر ایک پھول سنور سنور گیا

شام ہوئی تو اس کی یاد، روح میں جلوہ گر ہوئی
ہم ہوئے در بدر تو کیا، کوئی تو اپنے گھر گیا

کشتِ سراب کھل گئی، منزلِ خواب مل گئی
میں نہ پہنچ سکا وہاں پر مرا ہم سفر گیا

تیری صدا کا جوش ہے، عرش اُدھر خموش ہے
دیکھ لے اے دریدہ دل تیرا بھی اب اثر گیا

کاسۂ زہر اس کے ہاتھ، شہر کا شہر اس کے ساتھ
جان عزیز تھی بہت ملنے اسے مگر گیا

دار پہ سر بلند ہوں، شاعرِ دل پسند ہوں
لے کے عروج پر مجھے ساتھ مرا ہنر گیا

شوقِ سوال کی قسم، رنگِ جمال کی قسم
تیرے جلال کی قسم، میں وہ نہیں جو ڈر گیا

تیرا مرا ہے ربطِ خاص، بس میں نہیں مرے حواس
تُو نے کہا تو جی اٹھا، تو نے کہا تو مر گیا

اپنا آپ سدا منظر میں رکھتے تھے ہم
آنکھیں اس کی راہ گزر میں رکھتے تھے ہم

ٹھوکر کھائی ہے تو شدت سے یاد آیا
کبھی زمانہ اک ٹھوکر میں رکھتے تھے ہم

گھٹ گھٹ کے جینے میں ہم کو لطف آتا تھا
اپنے پَیر اپنی چادر میں رکھتے تھے ہم

مٹی کی خوشبو سے سانس چلا کرتی تھی
کچا آنگن اپنے گھر میں رکھتے تھے ہم

آہ کے شعلوں سے تاثیر نکالا کرتے
خواب کا مسکن چشمِ تر میں رکھتے تھے ہم

ریکھاؤں میں کیا کیا لکھا ہوا کرتا تھا
اور دعا امکانِ اثر میں رکھتے تھے ہم

کتنے پھول کھلا کرتے تھے دل کے چمن میں
کتنے چہرے ایک نظر میں رکھتے تھے ہم

آئینے سے آنکھ ملا کر زندہ رہتے
ایک توازن خیر و شر میں رکھتے تھے ہم

ہستی کا سراغ لگ چکا ہے
اک اور دماغ لگ چکا ہے

نفرت کا بیج بونے والو
دیکھو یہاں باغ لگ چکا ہے

جو دیکھے وہ دیکھے مسخ چہرہ
آئینے پہ داغ لگ چکا ہے

اب ڈھونڈو نشان تیرگی کا
اب ہاتھ چراغ لگ چکا ہے

ہونٹوں پہ ہے ثبت عکسِ قاتل
آنکھوں سے ایاغ لگ چکا ہے

پاسِ ناموس کرتے کرتے
ناموس پہ داغ لگ چکا ہے

اب جینا زیاں ہے زندگی کا
دل سوئے فراغ لگ چکا ہے

قابلِ رشک ہے تقدیر مرے قدموں کی
مجھ سے بھاری ہے یہ زنجیر مرے قدموں کی

ایک اک حرف میں منزل کے معانی مخفی
دشت در دشت ہے تحریر مرے قدموں کی

برسرِ آب مرے نقشِ کفِ پا روشن
کم نہیں قوتِ تعمیر مرے قدموں کی

فاصلے کچھ بھی نہیں عزمِ سبک رَو کے لیے
خواب آنکھوں کے ہیں تعبیر مرے قدموں کی

ایک وسعت کہ جسے لوگ زمیں کہتے ہیں
کی ہوئی ہے یہ بھی تسخیر مرے قدموں کی

میرے سینے پہ برسنے کو مچل جاتے ہیں
چاپ سن لیتے ہیں جب تیر مرے قدموں کی

چشمہ و سبزہ و رعنائی و جلوہ، خوشبو
رہگزاروں میں ہے تاثیر مرے قدموں کی

دشت میں قیس تو کہسار میں آیا فرہاد
سر پہ رکھے ہوئے تصویر مری قدموں کی

عشق میں ایسے کمالات دکھائے یاسرؔ
حُسن بن جاتا ہے جاگیر مرے قدموں کی

خواب میں ان سے ملاقات ہوئی، بات ہوئی
روشن و شوخ و حسیں رات ہوئی، بات ہوئی

مل کے آتا ہوں جب ان سے تو سبھی پوچھتے ہیں
کیا ہوا کچھ تو کہو بات ہوئی؟ بات ہوئی؟

ان کا اندازِ ستم پہلے تو ایسا نہیں تھا
جتنی بھی تلخیِ حالات ہوئی، بات ہوئی

آہ پر آپ کھنچی، سانس رکی، نبض تھمی
اشک بہتے رہے برسات ہوئی، بات ہوئی

دہنِ کانِ گہر بار نے برسائے گہر
دامنِ گوش کو خیرات ہوئی، بات ہوئی

ضبط کی سِل کو مری یاد نے سرکا ہی دیا
ان کے دل سے جو انھیں مات ہوئی، بات ہوئی

خامشی رشکِ خزاں پھول تھے برباد سبھی
رنگ و خوشبو انھیں سوغات ہوئی، بات ہوئی

دونوں آوازیں ملیں اک نئی آواز بنی
آج تو جیسے کرامات ہوئی، بات ہوئی

منتظر چشمِ دو عالم ہے کہ لمحہ بھر کھلے
دیکھنے کی تاب ہو تو وہ رخِ انور کھلے

نعمتِ حیرت گنوا کر زندگی [illegible] ہے
اپنی خواہش ہی نہیں ہے آنکھ پر منظر کھلے

جس طرف جی چاہتا ہے، اس طرف جاتا ہوں میں
میری آوارہ مزاجی کو ہیں بحر و بر کھلے

رشک ہے اُس پر صدف کو آنکھ میں رہتا ہے وہ
اہلِ دل ہو جوہری تو جوہرِ گوہر کھلے

شب سجائے رکھتی ہے اُس کے لیے آغوشِ حُسن
خواب میں آئے نہ ہم پر وہ پری پیکر کھلے

کام لیتا ہے جراحت کا نگاہِ نرم سے
کھلتے کھلتے ہم پہ سب اطوارِ چارہ گر کھلے

مہرِ تاباں اُن کی تابانی سے جل جائے علی
میری پیشانی کو چھو کر قسمتِ نیّر کھلے

اس نے کہا کہ تم کو محبت نہیں رہی
میں نے کہا کہ بس مری قسمت، نہیں رہی

اس نے کہا کہ آنکھ میں آنسو نہیں رہے
میں نے کہا کہ درد کی دولت نہیں رہی

اس نے کہا کہ شاعری نے کیا دیا تمھیں
میں نے کہا مجھے کوئی حسرت نہیں رہی

اس نے کہا کہ دل ہوا برباد کس لیے
میں نے کہا تمھاری حکومت نہیں رہی

اس نے کہا کہ آئنہ پہچانتا نہیں
میں نے کہا اب اتنی بھی شہرت نہیں رہی

اس نے کہا سناؤ تو کچھ ریگزار کی
میں نے کہا سنو! وہاں وسعت نہیں رہی

اس نے کہا کہ پہلے سی وارفتگی نہیں
میں نے کہا خلوص میں شدت نہیں رہی

اس [illegible] بدلنے سے کیا ہوا؟
میں نے کہا وہ [illegible]ل و شباہت نہیں رہی

میں نے کہا دلوں میں قرابت نہیں رہی
اس نے کہا نفاست و نکہت نہیں رہی

میں نے کہا مناتی ہو کیوں جیت کی خوشی؟
اس نے کہا شکست سے قربت نہیں رہی

میں نے کہا وہ عہدِ گزشتہ کراؤں یاد؟
اس نے کہا اب اس کی ضرورت نہیں رہی

میں نے کہا ادھوری تھیں تم تو مرے بغیر
اس نے کہا کہ آج یہ عادت نہیں رہی

میں نے کہا قرار تمھیں کس طرح ملا؟
بولی تمھاری یاد سے رغبت نہیں رہی

میں نے کہا بھلا دیا کس طرح میرا پیار؟
اس نے کہا بھلانے میں دِقّت نہیں رہی

میں نے کہا جھگڑتے، مناتے تھے، یاد ہے!
اس نے کہا وہ رسمِ شکایت نہیں رہی

میں نے کہا کلام کِیا بے رخی سے کیوں؟
اس نے کہا تمھیں بھی تو حیرت نہیں رہی

ہے کائنات حسیں، اعتراف ہے میرا
کہیں کہیں پہ مگر اختلاف ہے میرا

تمھارے کوہِ سماعت پہ کچھ اثر نہ ہوا
اگرچہ لہجہ بڑا واشگاف ہے میرا

تم ایک دوست ہو تم کو روا نہیں یہ لفظ
مری طرف سے تو دشمن معاف ہے میرا

تمھاری عظمت و رفعت پہ خم سرِ تسلیم
بس اپنی ذات سے ہی انحراف ہے میرا

تمھیں کسی سے محبت نہیں بجز اپنے
تمہارے بارے میں یہ انکشاف ہے میرا

ہے گرچہ دور بظاہر مرا مدینۂ عشق
خیال و خواب میں جاری طواف ہے میرا

ہوئی ہے دور سب آرائشوں کی آلائش
غبارِ گردشِ دوراں غلاف ہے میرا

ذرا بھی حسرتِ دنیا نہیں علی یاسر
کہ دل بھی صاف ہے دامن بھی صاف ہے میرا

طلسمِ حیرتِ بازار میں اُٹھاتا ہوں
میں خواب چشمِ خریدار میں اٹھاتا ہوں

کبھی گزرتے ہوئے تم مری طرف دیکھو
میں اپنے آپ کو دیوار میں اٹھاتا ہوں

بجا کہ میری ہی خود ساختہ ہے بربادی
خسارہ جتنا ہے ایثار میں اٹھاتا ہوں

خوش آ نہیں سکتی مجھے دل آزاری
خمیرِ نفی بھی اقرار میں اٹھاتا ہوں

ہجومِ تیز قدم سے مرا قدم ہے تیز
صدا، صداؤں کے انبار میں اٹھاتا ہوں

یہ واقعہ بھی رہا خوب، وہ بھی خوش میں بھی
مجھے کیا گیا مصلوب، وہ بھی خوش میں بھی

نہ میری جان گئی، عشق بھی کمال ہوا
نہ وہ ہوا مرا محبوب، وہ بھی خوش میں بھی

سبھی نے سر کو جھکایا وہاں پہ میرے سوا
زمانہ ہوگیا مرعوب، وہ بھی خوش میں بھی

یہی بہت ہے کہ تسلیم تو کیا اس نے
مرا سخن نہیں معیوب، وہ بھی خوش میں بھی

نہ دین کا ہے نہ دنیا کا اب علی یاسرؔ
ہے خستہ حالتِ مجذوب، وہ بھی خوش میں بھی

موجزن دل میں تھا اک یادوں کا دریا جل گیا
دھوپ کی شدت ہوئی ایسی کہ سایا جل گیا

آتشِ سوزِ جنوں سے اس قدر بے حال تھا
میری پیشانی کو چھوتے ہی مسیحا جل گیا

دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیکرِ شعلہ صفت
آرزوئے وصل کی رَو میں سراپا جل گیا

پھول سے شاداب چہرے تھے تر و تازہ یہاں
آگ وہ برسی کہ میرا شہر سارا جل گیا

زیرِ آب اک گوہرِ نایاب آتش بار تھا
اس کو حاصل کرنے کا جس نے بھی سوچا، جل گیا

آنکھ میں اس کی محبت، ہاتھ میں تیغِ سموم
آپ آپ آدھا ہوا میں اور آدھا جل گیا

کر کے میرے جسم و جاں کو بے رُخی کی نذر وہ
ہو کے حیران و پشیماں بولے اچھا جل گیا؟

الحذر اور الاماں تیری وہ آہِ آتشیں
یوں علی یاسرؔ مقدر کا ستارا جل گیا

بیانِ عزم نہیں عرضِ مدعا بھی نہیں
بتاؤں کیا مرے لفظوں میں حوصلہ بھی نہیں

مرے تو گھر کی بہاریں اسی کے دم سے ہیں
میں اپنے بیٹے کو اس ڈر سے ڈانٹتا بھی نہیں

چمن میں رہنے کا اب بھی کوئی جواز ہے کیا
ہماری پرسشِ احوال کو صبا بھی نہیں

غزل کے ساتھ جوانی جڑی ہے سانسوں کی
پہاڑ ہے مرے سینے سے جو ہٹا بھی نہیں

وہ بے وفا ہے مگر کیا کروں علی یاسرؔ
وہ یاد رہتا ہے اتنا کہ بھولتا بھی نہیں

دل میں غم پے بہ پے نہیں ہے
ا[illegible] کوئی روز [illegible] نہیں ہے

آسودہ ہوئے ہیں اشک پی کر
یہ نش[illegible] ے نہیں ہے

[illegible]یں کا سفر فلک زمیں کا
اک پل کی حیات، ہے نہیں ہے

ہم جانتے ہیں کہ عاشقی میں
مرجائیں تو پھر بھی جے نہیں ہے

سنتا ہی نہیں ہے کوئی یاسر
ہم جس کو بلائیں ''اے'' نہیں ہے

کارگر چال چل گئے رستے
کتنی جلدی بدل گئے رستے

کوئی پہنچا نہیں سرِ منزل
راہیوں کو نگل گئے رستے

فاصلہ تو نپٹ ہی جانا تھا
شام کے ساتھ ڈھل گئے رستے

جیسے جاتے ہیں خواب آنکھوں سے
پاؤں سے یوں نکل گئے رستے

جب سے بانٹا ہے میں نے غم ان کا
دھیرے دھیرے سنبھل گئے رستے

کوچۂ جانِ آرزو کی طرف
میرے ہمراہ کل گئے رستے

آبلے پھوٹ پھوٹ رونے لگے
ان کے اشکوں سے جل گئے رستے

میں نگہبان ہوں علی یاسؔر
اس لیے پھول پھل گئے رستے

زمین کانپتی ہے آسماں لرزتا ہے
عجیب خوف ہے سارا جہاں لرزتا ہے

بھنور کی طرح رہیں گردشوں میں آنکھیں بھی
بچھڑ کے آگ سے جیسے دھواں لرزتا ہے

مجھے تغیرِ دنیا پہ اعتبار آیا
کہ آج عکسِ رخِ مہرباں لرزتا ہے

ہوا ہے کشف جسے بھی رہے وہ گریہ کناں
جسے بنایا گیا رازداں لرزتا ہے

کوئی نہ جانے کہ بنیاد میں ہے کیا اُفتاد
کہ زلزلہ بھی نہیں اور مکاں لرزتا ہے

وہ حبس ہے کہ نہیں دم کسی کے سینے میں
وہ شور ہے کہ دیارِ اماں لرزتا ہے

یہ کس نے آئنہ دیکھا جمالِ نکہت کا؟
یہ کس کی تاب سے آبِ رواں لرزتا ہے؟

ہے راکھ اس کو اجل بھی وصال بھی یاسر
بہت دنوں سے دلِ نیم جاں لرزتا ہے

نقشِ روشن ابھی معدوم کیا جائے گا
جا بہ جا پھر اسے معلوم کیا جائے گا

خواب اتنے بھی نہ دیکھو کہ [illegible]
اس ہنر سے تمھیں محروم کیا جائے گا

اک تمنا کے تعاقب کا یہ خمیازہ ہے
سب تمناؤں کو مرحوم کیا جائے گا

چند سِکے یہاں تاریخ بدل دیتے ہیں
قاتلوں کو یونہی معصوم کیا جائے گا

اپنا غم بانٹ دیا اس نے زمانے بھر میں
کس طرح اب اسے مغموم کیا جائے گا

خوش گماں لوگ خسارے میں نہ رہ جائیں کہیں
طلبِ غم ہے سو مقسوم کیا جائے گا

نا سمجھ سوچ نہ مجھ کو کہ معمہ ہوں میں
[illegible] ے انداز [illegible] مفہوم کیا جائے گا؟

اس کی باتوں [illegible] یہ نکالا ہم نے
نقشِ امید کو [illegible] کیا جائے گا

لوحِ دل صاف ہمیشہ سے رہی ہے یاسر
جانے کس نام کو مرقوم کیا جائے گا

کوئی بھی مسئلہ ہو اس کا حل نکالتے ہیں
ہم اپنے بخت کی زلفوں کے بل نکالتے ہیں

خیال آیا ہے اپنا بہت زمانے بعد
چلو! کسی کے لیے کوئی پل نکالتے ہیں

نہ کوہسار نہ تیشہ نہ محورِ دل و چشم
جنوں کی ضد ہے کوئی نہر، چل نکالتے ہیں

بہت دنوں سے ہیں محروم تیری قربت سے
قرارِ دل ترا نعم البدل نکالتے ہیں

فضائے شہر میں رقصاں ہے رنج و خوف و ہراس
کوئی وظیفۂ ردِ اجل نکالتے ہیں

دلِ شکستہ ہمیں بے سکون رکھتا ہے
کوئی بھی لمحہ اگر بے عمل نکالتے ہیں

ہنر شکایتِ احباب کا نہیں ہم کو
جو ذکرِ خیر سدا بے محل نکالتے ہیں

سو رخت بستہ و تیار ہیں علی یاسرؔ
اہالیانِ دیار آج کل، نکالتے ہیں

زمیں کا رزق ہوئے آسماں سے اترے ہم
کسی حسین نظر کی کماں سے اترے ہم

پڑے ہوئے ہیں کسی طاق میں مثالِ کتاب
وہاں نہ رکھے گئے پھر جہاں سے اترے ہم

تمھارے دل کے دھڑکنے [illegible] ہے
گمان ہوتا ہے کوہِ گر[illegible]رے ہم

ہمارے سر پہ تھا سہرا اسے بسانے کا
بہت ملال ہوا، کہکشاں سے اترے ہم

جو منتظر تھے ہمارے انھیں خبر نہ ہوئی
ہمیں خبر ہے رخِ ناگہاں سے اترے ہم

قرار پائی صحیفہ صفت ہماری ذات
سو زینہ زینہ زبان و بیاں سے اترے ہم

بغیر وجہ بھلایا گیا ہمارا نام
بلا جواز دلِ دوستاں سے اترے ہم

ہمارے زیرِ زمیں جانے پر تحیر کیوں؟
نشستِ خانۂ نا مہرباں سے اترے ہم

ہے پستیوں سے شناسائی اب علی یاسر
ذرا بھی یاد نہیں ہے کہاں سے اترے ہم

کون کہتا ہے کہ آسان ہوا کرتا ہے
عشق آسودۂ نقصان ہوا کرتا ہے

اب ہم آتے ہیں اس انداز سے اپنے گھر میں
جیسے کوئی کہیں مہمان ہوا کرتا ہے

جب کبھی بزم سجائیں ہم اکیلے پن کی
سارا ماحول غزل خوان ہوا کرتا ہے

فکرِ اسباب میں دیوانی ہوئی ہے دنیا
اور دل بے سروسامان ہوا کرتا ہے

دِل کے لٹنے پہ پریشاں نہ ہوا کر یاسرؔ
یہ خسارہ تو مری جان ہوا کرتا ہے

تری جدائی کا غم سہہ سکوں، نہیں ممکن
ترے بغیر میں زندہ رہوں، نہیں ممکن

سفر نصیب ہوں پاؤں سکوں، نہیں ممکن
قرار پائے گا میرا جنوں، نہیں ممکن

سُنا رہی ہیں مری دھڑکنیں فسانۂ غم
مگر کبھی میں ترا نام لوں، نہیں ممکن

ورق سے نام مٹایا ہتھیلی پہ آیا
اب اس کے ہاتھ سے کیسے مٹوں، نہیں ممکن

بڑے ہنر کی بڑی بات ہے علی یاسر
مرے قلم میں نہ ہو میرا خوں، نہیں ممکن

اس نے کہا کہ میرا کہا مانتا ہے شہر
میں نے کہا کہ میری طرف دیکھتا ہے دہر

اس نے کہا سرشتِ صداقت سے فائدہ؟
میں نے کہا کہ دار ہے منزل مری کہ دہر

اس نے کہا کہ معجزۂ فن کوئی دکھا!
میں نے کہا یہ کوہ، یہ تیشہ، یہ میں، یہ نہر

اس نے کہا بتا وہ جوانی کہاں گئی؟
میں نے کہا کہ آ کے گزر بھی گئی وہ لہر

اس نے کہا کہ خوف اگر ہے تو کس کا ہے
میں نے کہا وہ دُور ہی رکھے ہر اپنا قہر

یہی سمجھئے انوکھی نہیں نرالی نہیں
یہ داستان کسی کو سنانے والی نہیں

تری رضا ہے تو پھر آنکھ بھر نظارہ دے
مری نگاہ تہی ہے مگر سوالی نہیں

خوشی ہو، غم ہو، ہمیشہ خموش رہتا ہوں
یہ بے نیاز طبیعت ہے لاابالی نہیں

ہنسی مذاق میں اس نے کہا بچھڑ جائیں
مگر نصیب نے ایسی سنی کہ ٹالی نہیں

گر ایک بار یہ پامال ہوگئی یاسرؔ
دوبارہ سلطنتِ قلب کی بحالی نہیں

تماش بیں ہے کوئی اور کوئی دھمال میں خوش
تم اپنے حال میں خوش اور ہم اپنے حال میں خوش

خبر نہیں ہے کہ صیاد کیوں تڑپتا ہے
بتائیں کیسے اسے ہم ہیں اُس کے جال میں خوش

کوئی شرر، کوئی نشتر، کوئی تبر، کوئی تیر
کہ زخم رہتا نہیں عہدِ اندمال میں خوش

ہر ایک چہرہ شکن بارِ غم، نگاہ میں نم
کوئی نہیں رہا اس شہرِ پائمال میں خوش

غرورِ شاعری تھا کس قدر علی یاسؔر
نہ رہ سکے کبھی اپنے اسی کمال میں خوش

جو دردِ دل ہے کسی اور کو بتا نہ سکوں
چلا نہ جاؤں وہاں پر جہاں سے آ نہ سکوں

یہ ناشناس گھر بار جانتے ہیں مجھے
میں اپنی اوک سے چنگاریاں گرا نہ سکوں

ہوا نے جلنے نہیں دی دِیا سلائی بھی
چراغ سامنے رکھا ہوا جلا نہ سکوں

جو شکل دھیان میں رہتی ہے، اجنبی ہو جائے
جو یاد آتا نہیں ہے اسے بھلا نہ سکوں

جو رونا چاہوں، دل و چشم سنگ بستہ ہوں
جو مسکرانے پہ آؤں تو مسکرا نہ سکوں

مشکل سے مشکل تر ہوتے جاتے ہیں حالات ہمارے
پھر بھی یہ کہتے ہیں اچھے کٹتے ہیں دن رات ہمارے

کون ہے جس کے آنے سے ہم چہکیں گے بھی مہکیں گے بھی
کون ہے جس کا رستہ تکتے رہتے ہیں جذبات ہمارے

خستہ اور شکستہ بنیادیں نہیں سونے دیتیں ہم کو
اک حسرت سے تاک رہی ہوتی ہے گھر، برسات ہمارے

شیریں تازہ، رس بھرے، پھول اور پھل سب ہی ہو جائیں اس کے
ٹوٹے پھوٹے، پیلے پیلے، سوکھے پات ہمارے

ظلمت اپنا جال بچھا کر چال پہ چال چلے جاتی ہے
اور معدوم ہوئے جاتے ہیں روشن امکانات ہمارے

ملالِ عزمِ سبک انتشار پھر سے کیا
شکست خوردہ حریفوں نے وار پھر سے کیا

دکھا رہا ہے وہ خوابِ بہارِ بے موسم
ہم ایسے سادہ مزاج اعتبار پھر سے کیا

تُو جا چکا تو یہ احساس تھا، گیا نہ کہیں
تُو آ گیا تو ترا انتظار پھر سے کیا

ہمارے دل کو پھر اس نے کیا ہے زیرِ نگیں
ستم کہ ہم نے اسے واگزار پھر سے کیا

وہ جا چکا تو مری آنکھوں نے علی یاسر
تماشئہ پسِ گرد و غبار پھر سے کیا

قیاس تھا کہ میں خوشحال ہوں گا اگلے برس
مرے نصیب میں لکھے گئے سب ایسے برس

یہ دورِ فرقت و بے چارگی نہیں کٹتا
کہ ان دنوں سے تو اچھے کٹے تھے پچھلے برس

ابھی تو اور تجھے انتظار کرنا ہے
ابھی سے تجھ کو نظر آ رہے ہیں لمحے، برس

سحابِ زندگی! تیری بڑی ضرورت ہے
ہماری پیاس کے صحرا کے پاس آ کے برس

کچھ اور مہلتِ بیداریٔ تمنا ہو
کہ ہم نے سو کے گزارے ہیں اپنے آدھے برس

شوق ہے اشکِ خوں بہانے کا
سوچیو مت! مجھے مٹانے کا

گھر کو برباد کر دیا جس نے
وہ کوئی فرد ہے گھرانے کا

زخم تو زخم ہے جگر کے لیے
دھیان کیا ہو نئے پرانے کا

اس لیے راستے پہ بیٹھا ہوں
کام ہے راستہ دکھانے کا

دل کو سمجھا رہا ہوں آخری بار
اب جو روٹھا نہیں منانے کا

حرص میں عمر قید کاٹتے ہیں
کھیل ہوتا ہے ایک دانے کا

شہر بے چہرگی کا مارا ہے
فائدہ آئنہ دکھانے کا؟

حسن والوں کو ہی علی یاسر
کام خوب آئے ہوش اڑانے کا

ہماری روح جسے پائمال کرتی رہی
وہ لاش ہم سے ہزاروں سوال کرتی رہی

ہمیں تو روکے رکھا تم نے اپنے ہاتھوں سے
جو کام تیغ نے کرنا تھا ڈھال کرتی رہی

عجیب طبع تھی اس کی جو لمحے لمحے میں
حسابِ دوستیٔ ماہ و سال کرتی رہی

کبھی تھا ہاتھ میں آئینہ اور کبھی پتھر
تمھاری یاد بھی کیا کیا کمال کرتی رہی

جنوں میں تیشے پہ سر کو رکھا سکون کِیا
یہ جُوئے شِیر تو مرنا محال کرتی رہی

نامرادی، شکست، حسرت ہے
عشق ہے یا کوئی مصیبت ہے

حُسنِ آئینۂ صداقت ہے
میرے ہمراہ میری حیرت ہے

میں رہِ علم کا مسافر ہوں
میرا ہر ایک پل عبادت ہے

میرے بد خواہ اپنی موت مریں
صبر میں یہ بڑی سہولت ہے

چھانتا ہوں میں خاکِ دشتِ حیات
قیس کو میرے ساتھ نسبت ہے

روگ وہ دل کو لگائے کہ پریشان کیا
ہم نے تو اپنے مسیحا کو بھی حیران کیا

عشق ایمان کا اور جان کا دشمن بھی ہے
اس نے داناؤں کے دانا کو بھی نادان کیا

درِ تعبیر کی زنجیر ہلاؤں کیسے
چشمِ آباد کو اک خواب نے ویران کیا

درد و غم جتنے بھی تھے میرؔ سے کم ہی نکلے
ہم ہوئے میرؔ کے دیوانے تو دیوان کیا

جو مقدر میں لکھا تھا سو لکھا تھا یاسرؔ
جو مقدر میں نہ لکھا تھا وہ نقصان کیا

آسودگیٔ جرأتِ انکار ملی ہے
سرکش ہوں مجھے دولتِ دستار ملی ہے

دل اور، جنوں اور ہے، سنگ اور ہے خشت اور
ہمسائے کی دیوار سے دیوار ملی ہے

جو خواب ہے خواہش کی خرابی کا خریدار
تعبیر بھی اس خواب کو بیمار ملی ہے

اخلاق سے دشمن کے بھی دل جیت چکا ہوں
احباب سمجھتے ہیں مجھے ہار ملی ہے

بک جانے کو جی چاہ رہا ہے علی یاسر
اس شہر کو وہ رونقِ بازار ملی ہے

ہم نے تو ناخدا کیا، تم نے ہمیں بھلا دیا
آپ ہی سوچو کیا کیا، تم نے ہمیں بھلا دیا

عزم تھا پار اتر گیا، شوق تھا پار اتر گیا
خوب کیا بھلا [illegible] نے ہمیں بھلا دیا

عشق میں ایسے غرق تھے، غافلِ غرب و شرق تھے
خود سے ہمیں خفا کیا تم نے ہمیں بھلا دیا

داغ لہک لہک اٹھے، خواب دہک دہک اٹھے
غم کا چمن کھلا کیا، تم نے ہمیں بھلا دیا

گزری حیاتِ بے کسی، ہم تھے، ہماری بے بسی
یاد پہ اکتفا کیا، تم نے ہمیں بھلا دیا

دردِ آسودۂ فرقت ہی نہ ہو جائے مجھے
سوچتا ہوں کہ محبت ہی نہ ہو جائے مجھے

تجھ سے ملتا ہوں تو رکھتا ہوں نگاہیں نیچی
آنکھ اٹھاؤں کہیں چاہت ہی نہ ہو جائے مجھے

لاکھ محروم سہی، تُو کوئی احسان نہ کر
تیرے احسان کی عادت ہی نہ ہو جائے مجھے

محو رکھا ہے سدا تُو نے کسی مقصد سے
کارِ دنیا کہیں فرصت ہی نہ ہو جائے مجھے

اپنی آوارہ مزاجی کا خیال آتا ہے
تنگ دنیا کی یہ وسعت ہی نہ ہو جائے مجھے

ایک پندارِ امانت ابھی لوٹانا ہے
حکم کوئی پئے ہجرت ہی نہ ہو جائے مجھے

حال اب اور نہ پوچھ، اور نہ پوچھ، اور نہ پوچھ
تجھ سے اے جان شکایت ہی نہ ہو جائے مجھے

اس پہ قربان ہوا تو یہ نہ سوچا یاسرؔ
اب کبھی میری ضرورت ہی نہ ہو جائے مجھے

نظم کر لیتے ہیں منظوم نہیں ہوتے ہم
کشتۂ علم ہیں معلوم نہیں ہوتے ہم

تجھ سے پہلے بھی کئی ہم پہ زمانے آئے
اے زمانے کبھی معدوم نہیں ہوتے ہم

استعاروں کے ستاروں میں رہیں پوشیدہ
مظہرِ معنی و مفہوم نہیں ہوتے ہم

دل کے احوال کو دل ہی میں رکھا کرتے ہیں
اپنی پیشانی پہ مرقوم نہیں ہوتے ہم

کبھی جنت، کبھی دنیائے جہنم صورت
آزماتے ہو کہ محکوم نہیں ہوتے ہم

شکر کرتے ہیں کہ یہ ایک سہارا تو ہے
بس تری یاد سے محروم نہیں ہوتے ہم

اشک پیتے ہیں تو جیتے ہیں وگرنہ یاسرؔ
کیا کرشمہ ہے کہ مسموم نہیں ہوتے ہم

تُو نے مانگا جو سو دیا میں نے
زندگی تجھ کو رو دیا میں نے

دکھ ہے، تُو نے مجھے غلط سمجھا
غم نہیں، ت[illegible]ھو دیا میں نے

چشمِ دریا صفت میں خوابوں کا
ہر سفینہ ڈبو دیا میں نے

آنسوؤں نے مری وکالت کی
اور ہر داغ دھو دیا میں نے

زندگی ہے مری مگر اس کا
فیصلہ غیر کو دیا میں نے

سخنوروں کا قبیلہ ہے اور میں بھی ہوں
مجھے قلم کا وسیلہ ہے اور میں بھی ہوں

خزاں کے مدِ مقابل رہا ہمیشہ میں
نخیلِ خواب بھی پیلا ہے اور میں بھی ہوں

ہوائے دشتِ بلا خیز کی جسارت کیا
ہوں جس کی آڑ میں ٹیلا ہے اور میں بھی ہوں

میں ایک فرد ہوں سقراط کے گھرانے کا
یہ آسمان بھی نیلا ہے اور میں بھی ہوں

تُو اپنے در پہ کسے سجدہ ریز چاہتا ہے
اک آرزوئے علیلہ ہے اور میں بھی ہوں

امید ہے کہ سفر یادگار گزرے گا
کہ ہم سفر بھی سریلا ہے اور میں بھی ہوں

عجیب لطف کی حامل ہے خمرِ خونِ جگر
ہر ایک شعر نشیلا ہے اور میں بھی ہوں

خوش گمانی پسِ تردید لیے جاتی ہے
آخری سانس تک امید لیے جاتی ہے

چشم و دل گل کے سفینے پہ بہے جاتے ہیں
کس طرف حسرتِ بے دید لیے جاتی ہے

شب کے دامن میں بھرے چاند ستارے جس نے
شام وہ صورتِ خورشید لیے جاتی ہے

آگے والوں کے تعاقب میں چلے جاتے ہیں
ہم کو یہ دائمی تقلید لیے جاتی ہے

اپنی منزل کوئی تعبیر نہیں ہے یاسرؔ
ہم کو اک خواب کی تاکید لیے جاتی ہے

کیا ہوا عہدِ جوانی مجھے معلوم نہیں
تم کہو اپنی زبانی مجھے معلوم نہیں

میں جو محسوس کیا کرتا ہو[illegible]یا ہوں
آپ کی درد کہانی مجھے معلوم نہیں

جانے کیا سوچ کے تم مجھ کو خفا کرتے ہو
کیا کوئی ہے مرا ثانی، مجھے معلوم نہیں

باعثِ نقل مکانی تو مرے اپنے ہیں
منزلِ نقل مکانی مجھے معلوم نہیں

زندگی کو تو سمجھتا ہوں فنا کا سایہ
یہ محبت بھی ہے فانی مجھے معلوم نہیں

میں نئے عہد کا شاعر مرا لہجہ ہے جدید
طرزِ اظہار پرانی مجھے معلوم نہیں

اس کے انکار [illegible]وتا ہے تحیر یاسر
جیسے انکار کے [illegible]نی مجھے معلوم نہیں

اس کے ہاتھوں سے زہر پینا ہے
زندگی اجنبی حسینہ ہے

کچھ نہ اپنے سوا نظر آئے
کیا ترے پاس چشمِ بینا ہے؟

در بدر کیوں ہے دردِ کوہ صفت
اس طرف آ یہ میرا سینہ ہے

اس کا اپنا مقام بھی تو گیا
جس نے میرا مقام چھینا ہے

ہے یہ غیبی صدا علی یاسرؔ
ترا محسن شہِ مدینہ ہے

منافقوں کا رویہ بدل نہیں سکتا
میں ایسے لوگوں کے ہمراہ چل نہیں سکتا

جگر میں تاب نہیں ہے مگر یہ بات نہیں
کہ کھاؤں تیر پہ تیر اور سنبھل نہیں سکتا

پروں سے دے کے ہوا آگ کو بڑھاتا ہے
پتنگا شمع پہ گر کر پگھل نہیں سکتا

حقیر تر ہے یہ بنجر زمین دنیا کی
وفا کا بیج یہاں پھول پھل نہیں سکتا

اجل کی جاں پہ مری وجہ سے بنی ہوئی ہے
مگر جو وقت مقرر ہے ٹل نہیں سکتا

دل کے زخموں کو دکھایا بھی نہیں جا سکتا
اور دنیا سے چھپایا بھی نہیں جا سکتا

دوستی اور محبت میں رہی جو حائل
فرقِ دیوار مٹایا بھی نہیں جا سکتا

بے خطا خلق ہوئی مجھ سے خفا، میرے خلاف
شہر کو اپنا بنایا بھی نہیں جا سکتا

اپنے سائے سے ذرا پوچھ کے اتنا تو بتا
ساتھ اس کے مرا سایا بھی نہیں جا سکتا

عہد پر عہد کیے جاتے ہو تم لوگوں سے
اور کوئی عہد نبھایا بھی نہیں جا سکتا

لایئے آپ کی مشکل کو میں آساں کر دوں
آپ سے زہر پلایا بھی نہیں جا سکتا؟

آپ تو اپنے ہیں اس دل سے کہاں جائیں گے
اس میں آئے تو پرایا بھی نہیں جا سکتا

دیکھ جی بھر کے مجھے، دیکھ لے جی بھر کے مجھے
میں ہوں وہ جس کو بھلایا بھی نہیں جا سکتا

بعد مدت کے مجھے اس نے صدا دی یاسرؔ
لیکن اب لوٹ کے آیا بھی نہیں جا سکتا

ڈھونڈتا ہوں میں خود کو آئینے کی صورت
زندگی ملی مجھ کو حادثے کی صورت

دشت نے مثالِ گُل کر دیا تھا رخصت
شہر محوِ استقبال آبلے کی صورت

اپنا اپنا شوقِ دید، اپنی اپنی آنکھیں
دیکھتے رہے ہم ایک دوسرے کی صورت

اس کے حسنِ کامل کا نقش نقش بھولا
کاش اب نکل آئے دیکھنے کی صورت

کس طرح اب استقبال کر سکوں گا یاسؔر
آ رہے ہیں غم اب تو قافلے کی صورت

رنگ و بُو رہتے ہیں وابستہ مرے پہلو سے
خواب میں ہاتھ ملایا تھا کسی گُل رُو سے

آج ہی اذن ملا ہے مجھے گویائی کا
اور الگ ہوتی نہیں مِری زباں تالو سے

عشق ہے پیر مرا اُس نے مجھے حکم دیا
ہجر تعویذ کِیا، باندھ لِیا بازو سے

میں تہہِ تابِ تمنا رہوں پتھرایا ہوا
تُو مجھے آ کے جگا دے ذرا اب خوشبو سے

میں کہ مضمونِ محبت تھا ستاروں سے لکھا
باندھ کر لے گئی اک روز ہوا پلو سے

رہنے کے واسطے مجھے اپنی نگاہ دے
اے حسنِ بے پناہ مجھے بھی پناہ دے

ورنہ بلا جواز دھڑکتا رہے گا دل
اس تشنۂ ازل کو مئے رسم و راہ دے

آنکھیں سلگ رہی ہیں جگر برف خوردہ ہے
دریائے اشک دے کبھی صحرائے آہ دے

ہاں خواب میرے پاس ہے تعبیر تیرے پاس
تُو اپنے غم کو میری خوشی سے بیاہ دے

تجھ کو ترے حبیب کی زلفوں کا واسطہ
مولا تُو آج بخش مرا ہر گناہ دے

ایسے شکم کی آگ بجھانی پڑی مجھے
اپنے بدن کو آگ لگانی پڑی مجھے

ہاتھوں میں اک لکیر بنانے کے واسطے
ہاتھوں سے ہر لکیر مٹانی پڑی مجھے

جی بھر کے کھیلے دل سے حسینانِ بے وفا
مہنگی بہت زیادہ جوانی پڑی مجھے

محفل میں قہقہوں نے وہ طوفاں اٹھا دیا
یوں اپنی داستان سنانی پڑی مجھے

تھا انتظارِ عدل میں یہ سر جھکا ہوا
پھر منصفوں سے آنکھ ملانی پڑی مجھے

پیکر کی نظر اتارتے ہیں
سب رنگ اسے پکارتے ہیں

سب اہلِ خرد اسی کی دُھن میں
دیوانوں کا روپ دھارتے ہیں

گرتا ہے فلک ہمارے سر پر
یہ بوجھ ہمیں سہارتے ہیں

ان میں انسانیت کہاں ہے؟
معصوموں کو جو مارتے ہیں

دل جیتنے کی لگن عجب ہے
دل خود ہی اپنا ہارتے ہیں

گھر سے باہر تھے چاہے گھر پر تھے
ہم کسی خواب کے سفر پر تھے

لے گئے سر اتار کر میرا
وہ جو کل تک سوار سر پر تھے

آسماں سے پرے کے رستے بھی
منکشف میرے بال و پر، پر تھے

وہ جو اس نے ہماری سمت نہ کی
سارے امکاں اسی نظر پر تھے

ٹوٹتے پھوٹتے ہمارے دل
ٹوٹتی پھوٹتی خبر پر تھے

رینگتے سانپ نے دبوچ لیا
وہ اڑا کیوں نہیں اگر پر تھے

دیکھتے تھے مرا تماشا وہ
مطمئن چشمِ کارگر پر تھے

صبح سے شام ہو گئی یاسرؔ
ایک ہم تھے جو اس کے در پر تھے

سنگِ پوشیدہ رخ آئنہ ہونے کو ہے
اب ترا اور مرا فیصلہ ہونے کو ہے

منتظر ایک زمانہ ہے کسی لمحے کا
دل یہ کہتا ہے کوئی معجزہ ہونے کو ہے

منزلِ مثلِ مسیحا ملے جانے کب تک
پاؤں میں آبلہ در آبلہ ہونے کو ہے

کون آیا ہے یہ مخمور نگاہوں والا
جس پہ قربان سبھی میکدہ ہونے کو ہے

عالمِ خوف میں نیند آئے نہ آئے یاسرؔ
خواب تعبیر سے بے سلسلہ ہونے کو ہے

اپنی آنکھوں کا شغف دیکھتا ہوں
تیرے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں

یہ سمندر ہے مرا آئینہ
نہ گہر اور نہ صدف دیکھتا ہوں

خارجیت کے نشانے پہ میں
ہر گھڑی سوئے نجف دیکھتا ہوں

خواب تعبیر سے مشروط نہیں
ہے یہی میرا شرف، دیکھتا ہوں

سر بلند اور ہوا ہوں یاسرؔ
اس کو شمشیر بکف دیکھتا ہوں

شوقِ منزل نہیں ہمارا
شاید کوئی دل نہیں ہمارا

جینے کی اور بات ہو گی
مرنا تو نہ[illegible]جل ہمارا

لَوٹا دے امانتیں ہماری
ایسا ساحل نہیں ہمارا

کرنا تو جستجو ہماری
ملنا مشکل نہیں ہمارا

ہر چیز ہمارے سامنے ہے
دیدہ غافل نہیں ہمارا

ہم عہدِ شکست کر چکے ہیں
اب مستقبل نہیں ہمارا

اک شمعِ شکستہ خواب یاسرؔ
ماہِ کامل نہیں ہمارا

آنکھوں میں اکثر کٹتا ہے رات کا حصہ
تنہائی کی وحشت میری ذات کا حصہ

بچھڑ گئے تو دونوں بے مفہوم ہوئے
جیسے کاٹ دیا جائے اک بات کا حصہ

تیرے نام کی ایک لکیر جہاں روشن ہے
راہ دکھاتا ہے وہ میرے ہاتھ کا حصہ

اس کے سوا اب روز و شب کٹتے نہیں میرے
وہ ہے اس درجہ میری عادات کا حصہ

بانٹ دِیا کرتا ہوں زائد روزی یاسرؔ
مری طلب ہے صرف گزر اوقات کا حصہ

مرکزِ چشمِ خاندان تھا میں
اپنے بچپن میں بھی جوان تھا میں

ایک آرائشِ زمینِ حسیں
ایک تزئینِ آسمان تھا میں

عکسِ فردا کا منقسم لمحہ
پرتوِ عزمِ بے نشان تھا میں

حظ اٹھایا سبھی نے حسبِ مزاج
رنج و فرحت کی داستان تھا میں

اک خزانہ دلوں کا تھا یاسرؔ
اور اس پر براجمان تھا میں

وقت سے پہلے ہم اپنے گھر گئے
جب ہنر جینے کا آیا مر گئے

آبلہ پا، چشمِ گریاں، خوں جگر
دشت کو سیراب تو ہم کر گئے

کچھ ادھوری خواہشوں کی سیپیاں
پوچھتی ہیں کس طرف گوہر گئے؟

لگ چکی ہوگی یقیناً فردِ جرم
ہم سے پہلے وہ سرِ محشر گئے

واپسی کے راستے کیوں بند ہیں؟
اس طرف تو لوگ متواتر گئے

ہم نہ گر آ پائے کہنے الوداع
آپ کب جاتے ہوئے مل کر گئے

سر بلندی بھی انھیں ملتی رہی
عشق میں جن سروروں کے سر گئے

رات کی تاریکیاں راس آگئیں
روشنی کا سوچ کر ہم ڈر گئے

خیر مقدم سرخروئی نے کیا
جس طرف بھی فاتحِ خیبر گئے

ہم علی یاسرؔ یہاں کیوں کر رہیں
وہ سبھی جو ہم سے تھے بہتر، گئے

آئینۂ تنہائی سرِ شام ہے درپیش
جاتا ہوں جدھر حسرتِ ناکام ہے درپیش

اٹھتا ہے قدم اور زمیں پر نہیں پڑتا
آغازِ سفر، ساتھ ہی انجام ہے درپیش

اک جہدِ تمنائے جنوں خیز ہوئی ختم
اک سلسلۂ عرصۂ آرام ہے درپیش

میں تیشے بغیر آج کروں گا اسے تسخیر
جو کوہِ گراں صورتِ آلام ہے درپیش

منزل پہ نظر آیا سرابوں کا سمندر
یعنی، ہے سزا یا کوئی انعام ہے درپیش

خود بنے صاحبِ دستار، کوئی ہوتا ہے
ایسے لوگوں کا بھی کردار کوئی ہوتا ہے

دل بہ کف دیتے چلے جائیں صدائیں ہر جا
اس خرابے کا خریدار کوئی ہوتا ہے

میں نے سینے سے لگا رکھے ہیں دشمن اپنے
ہر گھڑی بر سرِ پیکار کوئی ہوتا ہے

کتنے امکاں نکل آتے ہیں تری باتوں سے
تیرا انکار بھی انکار کوئی ہوتا ہے

میری قیمت بھی لگائیں سبھی حسبِ توفیق
جس طرح مصر کا بازار کوئی ہوتا ہے

نام آباد ہے اس شہر کا، ہے کب آباد؟
زندہ رہنے کا بھی معیار کوئی ہوتا ہے

میں خموشی سے نکل آتا ہوں اس محفل سے
شک بھی ہو جائے کہ بیزار کوئی ہوتا ہے

دوست احباب وہی ہوتے ہیں آگے پیچھے
ہائے بے چارے، سروکار کوئی ہوتا ہے

پہلی بار اس کو جو دیکھا تو یہ احساس ہوا
کیا بھلا ایسا کہیں یار کوئی ہوتا ہے

سوچتا ہے وہ ضرور اتنا جو یاسرؔ سے ملے
اس قدر بھی گل و گلزار کوئی ہوتا ہے

سچ ہے عالی جناب، ہوتا نہیں
دوستوں میں حساب ہوتا نہیں

جس کا ہر ایک پل سہانا ہو
زندگی کوئی خواب ہوتا نہیں

جو حقیقت ہو صاف کہتا ہوں
مجھ سے پاسِ حجاب ہوتا نہیں

سوچتے ہو صلہ عبادت کا
اس طرح تو ثواب ہوتا نہیں

سبزہ و آب و تاب ڈھونڈتے ہیں
سارا صحرا سراب ہوتا نہیں

رخ فراموش ہو گئے ہیں سبھی
آئینہ بازیاب ہوتا نہیں

پارساؤں کا پارسا تھا دل
عشق سے اجتناب ہوتا نہیں

جس قدر تُو ہوا علی یاسرؔ
کوئی خوار و خراب ہوتا نہیں

شعر کی صورت فروغِ فیضِ عام اپنا کروں
خواب خوشبو کی طرح پھیلیں تو نام اپنا کروں

میں کسی حاکم پہ ضائع کیوں سلام اپنا کروں
حاضری دینے سے تو اچھا ہے کام اپنا کروں

حرف کردار و انا پر اس لیے آتا نہیں
دوسروں سے قبل میں خود احترام اپنا کروں

ہو نظر تیری، کہ دل تیرا، کہ تیری گفتگو
چاہتا ہوں میں کہیں پیدا مقام اپنا کروں

میں مناسب وقت کا ہوں منتظر، خاموش ہوں
آپ کہتے ہیں ابھی قصہ تمام اپنا کروں

نام لینا ہی نہیں اس کا، یہ کھائی تھی قسم
اس لیے اب تذکرہ ہر صبح و شام اپنا کروں

دیکھتے ہیں کون اپنی بات پر قائم رہے
آپ کہہ کر دیکھیے میں اختتام اپنا کروں

ہیں مرے مولا محمدؐ، اس لیے مولا علیؑ
کیوں سوائے مرتضٰی کوئی امام اپنا کروں

ہو گیا رخصت علی یاسرؔ میں اتنا سوچ کر
کیوں پرائے شہر میں آخر قیام اپنا کروں؟

ہمارے سامنے سارا سفر تمھارا ہے
اب آ گئے ہو تو اس دل میں گھر تمھارا ہے

میں سایہ کرنے میں کنجوس تو نہیں پھر بھی
یہ شاخ شاخ، یہ برگ و ثمر تمھارا ہے

تمھارے تحفے ہیں خوشیوں غموں کی صورت میں
ہے شاعری مری لیکن ہنر تمھارا ہے

اسی لیے دل و جاں کردیے تمھارے نام
ہے جتنا قرض مری ذات پر، تمھارا ہے

کچھ ایسا نقش یہاں چھوڑ، ٹوٹے دل کو جوڑ
یہاں قیام بہت مختصر تمھارا ہے

ملال، کرب، سخن، سوز، غم لکھا گیا ہے
ستم تو یہ کہ تمنا سے کم لکھا گیا ہے

ہے میرے عزم کی آنکھوں میں آسماں سارا
یہ دشت میرے لیے دو قدم لکھا گیا ہے

ہماری الجھنیں سمجھائیں کیا، بتائیں کیا
نگارِ عقل پہ عکسِ صنم لکھا گیا ہے

دیا ہے قدر شناسوں نے شاعری کا نام
اگرچہ حالِ دلِ زیر و بم لکھا گیا ہے

سفر کے بعد سفر، اور سفر، سفر ہی سفر
جنم کے بعد جنم اور جنم لکھا گیا ہے

تمھاری تیغ نے قرطاس کا کِیا ہے کام
ہمارے ہاتھ ہوئے ہیں قلم، لکھا گیا ہے

ہمیں یقیں کہ حقیقت کھُلی رقیبوں کی
وہ خوش گماں کہ انھیں محترم لکھا گیا ہے

دل آشنا ہیں سبھی مطمئن علی یاسؔر
کہ میکدے کو کہیں تو حرم لکھا گیا ہے

سب امتحان زدہ مرحلوں کی خاطر ہے
ہماری زندگی تو دوسروں کی خاطر ہے

روا ہے پیرہنِ زخم کی شکست و ریخت
یہ اہتمام بدلتی رتوں کی خاطر ہے

کہیں سے آئے کہ تاخیر ہی نہ ہو جائے
کوئی دلاسہ اگر بے بسوں کی خاطر ہے

سہاریں جو لبِ یاقوت آفریں کا جمال
یہ سنگ بستہ نظر آئینوں کی خاطر ہے

ہماری طرزِ تبسم ہمارے گھر نہ گئی
یہ مسکراتی ہوئی محفلوں کی خاطر ہے

جاں لیوا نہر سے بچا ہوں
کیسے ترے قہر سے بچا ہوں

تُو نے تو بہت ڈبونا چاہا
دنیا! تری لہر سے بچا ہوں

دشتِ برفاب منتظر تھا
جلتے ہوئے شہر سے بچا ہوں

میں آب میں آبدار ٹھہرا
خونریزیٔ نہر سے بچا ہوں

آتا ہی نہیں یقین یاسؔر
مکّاریٔ دہر سے بچا ہوں

ٹوٹے ہوئے تیر آزمائیں
آؤ تقدیر آزمائیں

زہراب ہے زندگی کہ تریاق
اس کی تاثیر آزمائیں

کیا تاب ہے اپنے دست و پا میں
زورِ زنجیر آزمائیں

دل میں ہو اور بولتی ہو
ایسی تصویر آزمائیں

اس جانِ غزل کے در پہ یاسرؔ
بختِ تحریر آزمائیں

زہر فرقت کا یہ سارا پیا جا سکتا ہے
تجھ سے ملنے کا ارادہ کیا جا سکتا ہے

لکھا ہوتا ہے مقدر میں ہمہ دم مرنا
اتنا جی لیتے ہیں جتنا جیا جا سکتا ہے

جس میں رہتے ہوئے ناموس پہ حرف آتا ہو
ایسی بستی سے کنارہ کیا جا سکتا ہے

جس کی جاں ہے اسے واپس بھی تو کر سکتے ہیں
جس کا دل ہے اس لَوٹا دِیا جا سکتا ہے

دل میں موجود ہے جو روزِ ازل سے یاسؔر
کون کہتا ہے یہ بخیہ سِیا جا سکتا ہے

اگرچہ عشق خوش امکان بھی ہے
مسلسل خدشۂ نقصان بھی ہے

چہکتا، ہنستا، بستا شہرِ دنیا
مگر در اصل یہ ویران بھی ہے

مجھے تُو نے بھلانا ہے بھلا دے
کہ یہ تیرے لیے آسان بھی ہے

مسیحا میں ترے قربان جاؤں
تُو میرے درد سے انجان بھی ہے

ترؔی یادوں سے دولت مند یاسر
اگرچہ بے سر و سامان بھی ہے

بنتی ہی رہی ہدف تمنا
میرے لیے ہے شرف تمنا

دیوار کے اُس طرف خدا ہے
دیوار کے اِس طرف تمنا

درپئے ہے عدو کا حسنِ کامل
اور سامنے صف بہ صف تمنا

میں ہی اجداد کی دعا ہوں
کرتے تھے مری سلف تمنا

ہے عشق ہمارا پیشہ یاسؔر
رکھتے ہیں فقط شغف تمنا

ظاہر ہے کہ خوش حواس ہوں میں
اندر سے بہت اداس ہوں میں

دیکھے تو تمام خستگی ہے
سمجھے تو ترا لباس ہوں میں

خوش آتی نہیں کوئی خوشی بھی
اک غم کو ایسا راس ہوں میں

میں ہوں تو کائنات بھی ہے
تعمیر کی اک اساس ہوں میں

انمول ہوں اور آ گیا ہوں
بازار سے ناشناس ہوں میں

لوحِ محفوظ پر ہے لکھی تلخ ہے، زندگی تلخ ہے
جانتا ہوں مری شاعری تلخ ہے، زندگی تلخ ہے

میرے دل یہ بتا تیری بے تابیاں حد سے کیوں ہیں سوا
تجھ کو سمجھایا تھا ناں بڑی تلخ ہے، زندگی تلخ ہے

میرے ہمراہ اک بد نصیبی رہی اور غریبی رہی
کل بھی تھی تلخ اور آج بھی تلخ ہے، زندگی تلخ ہے

میری عادت سدا مسکرانا بھی ہے غم چھپانا بھی ہے
غم گراں بار ہے اور خوشی تلخ ہے،زندگی تلخ ہے

پھر مری، دشمنی کے ثمر سے بہت آشنائی رہی
دوست سے یہ کہا دوستی تلخ ہے، زندگی تلخ ہے

مجھ کو تاریکیاں راس آتی رہیں، جگمگاتی رہیں
مجھ کو معلوم ہے روشنی تلخ ہے، زندگی تلخ ہے

پیشتر بھیجنے کے جو بتلایا تھا مجھ کو سمجھایا تھا
ہو رہا ہے گماں دوگُنی تلخ ہے، زندگی تلخ ہے

وسطِ صحرا میں آنسو سجاتا رہا، سرسراتا رہا
ہوں سراپا خزاں،نغمگی تلخ ہے، زندگی تلخ ہے

گویا قیامِ گاہِ خزاں سے چلے گئے
اچھے رہے جو لوگ یہاں سے چلے گئے

آئی نہ کوئی منزلِ کیف و نشاطِ شوق
اتنا ہم آگے آہ و فغاں سے چلے گئے

ہم ہی تھے دشتِ عشق میں ثابت قدم سدا
کتنے تو خوف کھا کے زیاں سے، چلے گئے

بولے ہمارے بارے میں سن کر وہ ہائے ہائے
افسوس ہے کہ یہ بھی جواں سے چلے گئے

محوِ نظارہ رہ گئی دنیائے ہم کنار
ہم اختلافِ آبِ رواں سے چلے گئے

کر کچھ تو خیال اِس طرف آ
اے بادِ شمال اس طرف آ

ذرپے ہوئی سنگ بار دنیا
آئینہ سنبھال اس طرف آ

رہنے دے عروج اُس طرف ہی
امکانِ زوال اس طرف آ

کہتے ہیں خزاں رسیدہ جذبے
تاثیرِ جمال اس طرف آ

میں بھول گیا ہوں تیری صورت
کچھ وقت نکال، اس طرف آ

اگرچہ حیثیت اس کی نہیں ہے خواب سے کم
ملی ہے زندگی مجھ کو مرے حساب سے کم

ترا جلال زیادہ ہے آفتاب سے بھی
ترا جمال نہیں حسنِ ماہتاب سے کم

تو کیوں نہ مہرِ تبسم لبوں پہ ثبت رہے
یہ انتظار ہے احساسِ اضطراب سے کم

کشش میں اور فزوں ہو گئے ہیں خطّ و خال
یہ تیرا حسن ہوا ہی نہیں نقاب سے کم

ذرا بھی زعم و تکبر نہیں علی یاسؔر
یقین ہے مجھے ہستی تو ہے حباب سے کم

اک اداسی پھرے سارے گھر میں
کون آئے گا ہمارے گھر میں

ایک مہتاب کے پاؤں چھونے
اتر آتے ہیں ستارے گھر میں

مجھ سے دیوار و در و روشن دان
پوچھتے ہیں ترے بارے گھر میں

راستے ان سے لپٹ جاتے ہیں
واپس آتے نہیں پیارے گھر میں

ہم بہل جاتے ہیں تنہائی سے
ڈھونڈ لیتے ہیں سہارے گھر میں

بازگشت ان کی رہے گی صدیوں
ہم نے جو لمحے گزارے گھر میں

جب سے وہ شعلہ صفت ہوا رخصت
رقص کرتے ہیں شرارے گھر میں

اضطراب اور بڑھا ہے یاسرؔ
آ گئے ہم تھکے ہارے گھر میں

اس نے کاٹی سزا کڑی مرے ساتھ
جب تری یاد چل پڑی مرے ساتھ

پہلوئے شاخ میں مثالِ گلاب
تو بھی اک روز تھی کھڑی مرے ساتھ

یادِ ماضی کی جھلملاتی ہوئی
رہ گئی ایک پھلجھڑی مرے ساتھ

تیری سانسوں کے پھول تازہ ہیں
آ گئی ہے کوئی لڑی مرے ساتھ

دفن اکیلا نہیں علی یاسر
لاکھ حسرت بھی ہے گڑی مرے ساتھ

سفر حیات کا اتنا کٹھن ہوا تو سہی
ہزار شکر کہ دل مطمئن ہوا تو سہی

گزر ہی جاتے ہیں لمحے خدا کرے
جو کام ہوتا نہ تھا تیرے بن ہوا تو سہی

سیاہ رات سے بڑھ کر ہیں وحشتیں اس کی
ہے خلق خوش کہ ذرا کو یہ دن ہوا تو سہی

یہ کیا کہ وصل کو مشروطِ زندگی کرنا
تُو انتظار کے لمحے نہ گن، ہوا تو سہی

اب اس کا سامنا کرنے سے کیا علی یاسر
گئے ہیں خواب نگاہوں سے چھن، ہوا تو سہی

آ رہا ہے نظر یہاں سے دور
اک ستارہ مگر یہاں سے دور

میں یہاں گر پڑا مری قسمت
ہیں مرے بال و پر یہاں سے دور

میری منزل مجھے بلاتی ہے
قصۂ مختصر یہاں سے دور

اپنی بستی پہ ہو رہا ہے گماں
میں رہا عمر بھر یہاں سے دور

اک مشقت کے بعد آیا ہوں
اتنی جلدی نہ کر یہاں سے دور

میں ہوں دامن کشا زمانوں سے
گر رہا ہے ثمر یہاں سے دور

حالِ آئندہ کہہ رہی ہے زباں
دیکھتی ہے نظر یہاں سے دور

سر پھرا تھا بہت علی یاسر
گر گیا کٹ کے سر یہاں سے دور

وہ قافلۂ حسن یہیں سے گزرتا ہے
دل والے قتل کرکے یقیں سے گزرتا ہے

دیدارِ آخری بھی تو کر اے دریچہ زن
گاڑی کا پہیہ خاک نشیں سے گزرتا ہے

تنہائی میں وہ اشک بہاتا ہے باضمیر
دنیا پکارتی ہے تو دیں سے گزرتا ہے

پھر عازمِ زمیں مجھے ہونا پڑا ہے آج
پھر آسمان اپنے مکیں سے گزرتا ہے

آتی ہے پھر مہک سی مجھے رفتگاں کی اب
لگتا ہے کاروان زمیں سے گزرتا ہے

فشارِ عصرِ رواں میں ہماری ہستی کیا
خود آگہی کے بغیر آبِ خود پرستی کیا

یہ اور بات ہے مشکل بہت گزر اوقات
سخنوری میں ہماری ہے تنگ دستی کیا

صدائے صدق و صفا جو بلند کرتے ہو
تو سنگسار نہ کر دے گی تم کو بستی کیا

سبھی کو بانٹتے پھرتے ہو اس کی رعنائی
یہ زندگی تمھیں پڑنے لگی ہے سستی کیا

بہت سے خواب ترستے رہے علی یاسرؔ
ہماری آنکھ کسی خواب کو ترستی کیا

کرتے کرتے یہ بھی آخر کر جانا ہے
تم پر مرتے مرتے اک دن مر جانا ہے

دو ہی باتیں سوچ کے تیرے شہر آیا ہوں
یا دستار ملے گی یا پھر سر جانا ہے

بہتے بہتے آنسو رکنے ہی والے ہیں
بھرتے بھرتے صبر کا دامن بھر جانا ہے

سب سے چھپ چھپ کر لکھتا رہتا ہے نظمیں
میرے بیٹے کو بھی تو مجھ پر جانا ہے

رہتا ہوں خاموش کہ میری عادت ہے یہ
بات نہیں کرتا میں جس کا اثر جانا ہے

روح نے جسم کے حبس کی آخری حد بھی دیکھی
تازہ ہوا کی خواہش میں باہر جانا ہے

پہلے کون پہنچتا ہے اب اس کے در پر
بادِ صبا کو میرے ساتھ اُدھر جانا ہے

سورج کے زندان میں رہتا ہوں میں یاسرؔ
شام ڈھلے گی تو پھر اپنے گھر جانا ہے

اس کو رہتی ہے امتحاں کی طلب
اور ہم کو نہیں ہے جاں کی طلب

اے دل و چشمِ اعتبار زدہ
کیسی آوارگی، کہاں کی طلب؟

کٹ ہی جاتے ہیں اس کے پر آخر
جس کو رہتی ہو آسماں کی طلب

وجہِ خوفِ خدا نہیں دوزخ
بندگی کو نہیں جناں کی طلب

بندۂ بو تراب کو نہ ہوئی
ہوسِ نام اور نشاں کی طلب

تاثیرِ دعا کے منتظر ہیں
ہم حکمِ خدا کے منتظر ہیں

کچھ لوگ فنا ہیں زندگی پر
کچھ لوگ قضا کے منتظر ہیں

کہنے کو بہار آگئی ہے
گُل بادِ صبا کے منتظر ہیں

خوفِ تلوار و دار بے کار
یہ سر تو ہما کے منتظر ہیں

مرنے والا معاف کرتا
سب خون بہا کے منتظر ہیں

یہ میرا بخت کہ میں عمر بھر اداس رہا
تُو کچھ ملال نہ کر میں اگر اداس رہا

مہک اُڑی تو اسی وقت پھول مرجھایا
مکیں گیا تو ہمیشہ کو گھر اداس رہا

نہ جانے کون گیا تھا قریب سے اٹھ کر
بہار لَوٹ بھی آئی شجر اداس رہا

مرے لیے ہوئی سرشار یہ بساطِ زمیں
مرے لیے رخِ شمس و قمر اداس رہا

کلام کرتا رہا تو رہا نہ ساتھ اپنا
ہوا خموش تو پھر ہمسفر اداس رہا

جس کے دل میں فتور آتا رہا
اس کے چہرے سے نور جاتا رہا

سایہ دیتا رہا زمانے کو
یوں شجر اپنا بور پاتا رہا

میں سمجھتا تھا اس کے قرب میں ہوں
وہ مجھے خود سے دور لاتا رہا

وحشتِ غم سے دل ہوا سرشار
قصرِ کیف و سرور ڈھاتا رہا

ہے وہ طوفاں مگر نہیں طوفاں
جو دلِ نا صبور اٹھاتا رہا

میرے پُرکھوں کی روایت ہے برا مت مانو
صاف گوئی مری عادت ہے برا مت مانو

تم سمجھتے ہو بغاوت ہے، برا مت مانو
میرے لہجے میں صداقت ہے برا مت مانو

ابھی آئے ہو ابھی جانا ضروری تو نہیں
بیٹھ جاؤ، تمھیں فرصت ہے، برا مت مانو

تجربہ کار ہوں محشر سے نہیں خوفزدہ
اِس جگہ روز قیامت ہے برا مت مانو

تم نے حق دار کو حق دینے میں غفلت کی ہے
دو اسے جس کی وراثت ہے برا مت مانو

کوئی صورت لبھاتی ہی نہیں ہے
محبت راس آتی ہی نہیں ہے

غریبی کی دعا ہرگز نہ مانگو
یہ آجائے تو جاتی ہی نہیں ہے

تمھاری یاد سے شکوہ ہے اتنا
کہ اب یہ دل جلاتی ہی نہیں ہے

حقیقت سے کہیں بڑھ کر ہے سچی
غزل کچھ واقعاتی ہی نہیں ہے

وہ کہتی ہے مقدر میں یہی تھا
مقدر کو جگاتی ہی نہیں ہے

مجھے جس نے سکھایا روٹھ جانا
میں روٹھوں تو مناتی ہی نہیں ہے

کتھا جیون کی لکھنے والے سن لے
کہانی مسکراتی ہی نہیں ہے

ہماری زندگی کا مسئلہ ہے
مرض یہ نفسیاتی ہی نہیں ہے

لکھا ہے ریت پر وہ نام یاسرؔ
ہوا جس کو مٹاتی ہی نہیں ہے

غلط غلط کہ عداوت بہت ضروری ہے
یقین کیجے محبت بہت ضروری ہے

جو دل دھڑکتا ہے، اس کی ہر ایک دھڑکن میں
کسی کے درد کی دولت بہت ضروری ہے

کٹا ہے فاصلہ ہم تم قریب آئے ہیں
اسی لیے تو مسافت بہت ضروری ہے

تری وفاؤں کے بدلے میں جان حاضر ہے
کم از کم اس کی یہ قیمت بہت ضروری ہے

مری طرف سے جنوں میں کمی نہیں یاسرؔ
تری کشش میں قیامت بہت ضروری ہے

مقدر کے ستارے کو چمک جانے کا خدشہ ہے
تری دنیا میں آ کر پھر بہک جانے کا خدشہ ہے

اُسے خوابوں میں بھی منزل نظر آئے تو میں جھوٹا
سفر کرنے سے پہلے جس کو تھک جانے کا خدشہ ہے

ہمیں بس تلخیاں ہی راس آتی ہیں محبت میں
تبھی تو صبر کے پھل! تیرے پک جانے کا خدشہ ہے

مرا دل ہے، اسے توڑو، سمندر بُرد بھی کر دو
کہ اس شعلے کے بجھ کر بھی بھڑک جانے کا خدشہ ہے

بلانے پر بھی ملنے کے لیے آتے نہیں مجھ سے
تمھیں کیا جان و دل مجھ پر چھڑک جانے کا خدشہ ہے؟

اگر اس بار بھی سیلاب کے تیور نہیں بدلے
پُلوں کے ٹوٹنے کا اور سڑک جانے کا خدشہ ہے

خلا میں کچھ نہیں تو روشنی کیوں چھن کے آتی ہے
یہ پردہ گر نہ ہو، دھرتی دہک جانے کا خدشہ ہے

تمھاری یاد کو دل میں سکونت مستقل دی ہے
نہ یہ جائے نہ ہی دل کی کسک جانے کا خدشہ ہے

وہ ہم سے بات کرنے کا تردّد کیوں نہیں کرتا
سرشتِ بدگماں کو اپنا شک جانے کا خدشہ ہے

جنوں کو جستجو تم بولتے ہو
یہ کیسی گفتگو تم بولتے ہو

میں آنکھیں بند کر کے دیکھتا ہوں
کہ میرے روبرو تم بولتے ہو

تمھاری تو زباں ہی کھینچ لوں گا
محبت کے عدو تم بولتے ہو

مجھی سے بولنا سیکھا تھا سوچو
مجھی کو آج تُو تم بولتے ہو

خموشی چاک کر دیتی ہے دل کو
یہ ہوتا ہے رفو، تم بولتے ہو

محبت کیوں ضروری ہو گئی ہے
ہے گرداں کیوں لہو، تم بولتے ہو

رقیبو! انقلاب آیا تو کیسے؟
یہ کیسی ہے نمو، تم بولتے ہو

سمندر کو تو کہہ دیتے سمندر
سو حیرت، آبجو تم بولتے ہو

ادھر ہے چاندنی تو اس طرف دھوپ
کبھی میں اور کبھو تم بولتے ہو

علی یاسر کہیں تو پھول کھلتے
اگرچہ رنگ و بو تم بولتے ہو

گہے خار، گاہے گلاب ہے، مرا خواب ہے
مرے واسطے جو عذاب ہے، مرا خواب ہے

مجھے مت کوئی تہی دست سمجھے جہان میں
یہ قلم ہے اور کتاب ہے، مرا خواب ہے

کئی حیرتوں کے ہیں زاویے مری آنکھ میں
ترے پاس کوئی جواب ہے؟ مرا خواب ہے؟

جو ازل ابد کے حصار میں نہیں آ سکا
جو گناہ ہے نہ ثواب ہے، مرا خواب ہے

کہیں آرزو، کہیں جستجو، کہیں گفتگو
کہیں اک شہیدِ شباب ہے، مرا خواب ہے

مرا سلسلہ نہ گمان سے، نہ جہان سے
یہ کوئی حیاتِ حباب ہے؟، مرا خواب ہے

مری زندگی، مری عاشقی، مری شاعری
مرا خواب ہے، مرا خواب ہے، مرا خواب ہے

مرے بعد کوئی سمجھ گیا تو سمجھ گیا
ابھی زیرِ چشمِ نقاب ہے، مرا خواب ہے

جسے پڑھ کے عشق و خلوص کی ملیں منزلیں
علی یاسر ایک نصاب ہے، مرا خواب ہے

مرگِ طلسمِ صبح کے آثار دیکھ کر
خورشید سو گیا مجھے بیدار دیکھ کر

کس کو شفائے حیرتِ بے مدعا ملی
کوئی طبیب مر گیا بیمار دیکھ کر

پھر بھی ہم انتہائی ہیں تنہائی کا شکار
ہم نے بنائے یار بھی دو چار دیکھ کر

ہیں اہلِ اختیار کہ محرومِ اعتبار
آئے نہ دام میں جو ترا پیار دیکھ کر

ہر زاویے پہ قوسِ قزح کا طواف تھا
روشن ہوئے ہم آپ کے رخسار دیکھ کر

کس میں ہے تاب اور ہیں پامال کس کے خواب
پہچانتا ہوں چشمِ خریدار دیکھ کر

مجھ سے لپٹ کے روتا رہا آئینے کا خواب
گرتی ہے میرے شوق پہ دیوار دیکھ کر

اہلِ جفا کی تو ہے ازل سے یہی روش
سر ہی اتار لیتے ہیں دستار دیکھ کر

میں اس کا انتظار ہی کرتا ہوں، خیر ہے
اُس بے وفا سے پیار ہی کرتا ہوں، خیر ہے

لوگوں پہ اعتبار کِیا اور دکھ ملا
لیکن میں اعتبار ہی کرتا ہوں، خیر ہے

ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملاتا ہوں شوق سے
چلئے یہ کاروبار ہی کرتا ہوں، خیر ہے

کیا تجھ کو اپنے دل پہ نہیں اختیار کچھ
تجھ سے نگاہیں چار ہی کرتا ہوں، خیر ہے

میں دشت ہوں تو پیاس کا میری ہے امتحان
دریا کو آج پار ہی کرتا ہوں، خیر ہے

وہ حادثہ ہوا چشم لہو لہو نہ رُکی
عجیب تھی یہ طبیعت کہ جو کبھو نہ رُکی

نہ میں رُکا نہ کسی کے لیے رُکاوٹ تھا
مری نمو سے کسی اور کی نمو نہ رُکی

فلک پہ مست رہا چودھویں کا چاند مگر
ہوا سے آج سمندر کی گفتگو نہ رُکی

چمن کے چاروں طرف اٹھ گئی ہیں دیواریں
گلاب اگتے رہے اور ان کی بُو نہ رُکی

ہزار بار یہ سر پتھروں سے ٹکرایا
چلی ہی جاتی ہے زنجیرِ جستجو، نہ رُکی

سبک رہی مری آواز سے تری رفتار
صدائیں دیتا چلا جا رہا ہوں، تو نہ رُکی

دہائی تھی کہ سبھی روگ مٹنے والے ہیں
کیا ہے اس نے جگر کو مرے رفو، نہ رُکی

خدا نے بخشی وہ آزادگی علی یاسرؔ
پہاڑ سامنے آئے پر آبجو نہ رُکی

سبھی کو ہم سے شکایت ہے اور کچھ بھی نہیں
ہماری تو یہی قسمت ہے اور کچھ بھی نہیں

تمھارے پاس نہیں ہے تو ہم سے لے جاؤ
ہمارے پاس محبت ہے اور کچھ بھی نہیں

پڑے ہیں در پہ تمھارے، تمھارے سائل ہیں
ہمیں تمھاری ضرورت ہے اور کچھ بھی نہیں

ہے میرا ذکر مری بدگمان محفل میں
بس اُن کے بخت میں غیبت ہے، اور کچھ بھی نہیں

جیو، مرو، جو کہے وہ کرو علی یاسر
نباہ کی یہی صورت ہے اور کچھ بھی نہیں

ہے کون شاعرِ خوش فکر، کون ہے فن کار
غزل بتائے گی جو اس میں نام کر کے گیا

Ghazal Bataay Gi

Ali Yasir

ISBN: 978-969-544-023-0